ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کے انشائیوں میں عصری شعور

مقالہ نگار

صوبیہ خان

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

نومبر ۲۰۱۸ء

ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کے انشائیوں میں عصری شعور

مقالہ نگار

صوبیہ خان

یہ مقالہ

ایم فل (اُردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگویجز

(اُردو زبان وادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

نومبر ۲۰۱۸ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے دفاع کو جانچا ہے وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن اور فیکلٹی آف ہائیر لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کے انشائیوں میں عصری شعور**

پیشکار: صوبیہ خان رجسٹریشن نمبر: 1106M.Phil/urd/F/15

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبہ زبان وادب اردو

ڈاکٹر بشریٰ پروین ____________________

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان ____________________

ڈین فیکلٹی آف لینگو یجز

بریگیڈئر محمد ابراہیم ____________________

ڈائریکٹر جنرل

____

تاریخ

اقرار نامہ

میں صوبیہ خان حلفیہ بیان کرتی ہوں اس مقالے میں پیش کیا گیا مواد میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز اسلام آباد کے ایم فل اردو سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر بشریٰ پروین کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گی۔

صوبیہ خان

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

نومبر ۲۰۱۸ء

فہرست ابواب

مقالے کا دائرہ کار

مقالے کا عنوان ''ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کے انشائیوں میں عصری شعور'' ہے۔ جس میں ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کے انشائیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس مقالے میں صرف سلیم آغا قزلباش کے انشائیوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پہلے باب میں انشائیوں میں عصری شعور بنیادی مباحث پر بحث کی گئی ہے۔

دوسرے باب میں سلیم آغا قزلباش کی انشائیہ نگاری کا موضوعاتی اور اسلوبیاتی جائزہ لیا گیا ہے۔

تیسرا باب ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کے انشائیوں میں عصری شعور ان کے انشائی مجموعے سرگوشیاں، آمنا سامنا،نام میں کیار کھا ہے ؟کے تناظر میں جائزہ لیا گیا ہے۔

چوتھے باب میں ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کی انفرادیت کو بیان کیا گیا ہے اور دیگر چند انشائیہ نگاروں کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔

پانچواں باب مجموعی جائزہ پر مشتمل ہے۔ آخر میں نتائج اخذ کیے گئے ہیں اور موضوع سے متعلق سفارشات بھی دی گئی ہیں۔ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کی انفرادیت کو اجاگر کرتے ہوئے اس مقالے کو مستند بنانے کی سعی کی گئی ہے تاکہ اردو ادب میں انشائیہ کو سمجھنے میں مدد ملے۔

Abstract

Contemporary sense in the personal essays of Dr. Saleem Agha Qazalbash. I have done research work base on the Personal essays of Dr.Saleem Agha Qaszalbash. He is famous for personal essays in Urdu literature, His three personal books have been published. This thesis consists of five chapters of personal essays of Dr. Saleem Agha. This research includes the published essays of Saleem Agha. First Chapter consists of the basic discussions of contemporary sense and Urdu personal essay. Second Chapter shows the topic and style of personal essay of Dr. Saleem Agha Qazalbash. Third Chapter contemporary sense in the light essays of the Saleem Agha Qazalbash according to his three books. Fourth chapter describes uniqueness of Saleem Agha Qazalbash. As compare to other writers fifth Chapter present the overall analysis of contemporary sense of his personal essay. At last finding as well as recommendation have been suggested.

An effort has been made to present the contemporary sense of Saleem Agha Qazalbash personal essays.

مقالے کا مقصد

اردو ادب کی بدلتی ہوئی فضاؤں میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں ان میں مختلف نئی اصناف کا اضافہ بھی شامل ہے۔ بدلتی ہوئی ادبی صورتحال نے لوگوں کی سوچ، فکر اور جذبات کو بدل ڈالا۔ قاری اور لکھاری دونوں کی سوچ کے زاویے نئے رنگ اختیار کرنے لگے۔ اسی ادبی قوس و قزاح کا ایک رنگ انشائیہ بھی تھا۔ دیگر ادبی اصناف کی طرح یہ صنف بھی مغربی سے سفر کرتی ہوئی برِصغیر تک پہنچی۔ انشائیے کی عمر کوئی اتنی طویل نہیں۔ انشائیہ نگار اپنے رنگ لطیف تحریروں کے ذریعے اس میں شامل کرتے رہے۔ انہی انشائیہ نگاروں میں ایک اہم نام ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کا ہے۔

ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش مشہور و معروف انشائیہ نگار ہیں ۔ میرے تحقیقی مقالہ کا موضوع" ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کے انشائیوں میں عصری شعور"ہے۔ اس مقالے میں ان کے انشائیوں کے تین مجموعوں کو شامل کیا گیا ہے۔ اردو ادب میں ان کے انشائیوں سے نثر میں جو اضافہ ہوا ان کو بھی عصری حوالے سے اجاگر کیا گیا ہے۔ اس تحقیق کا مقصد ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کے اُسلوب اُن کے انشائیوں کا معیار اور عصری شعور کی جانچ کرنا ہے ۔ ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کے انشائیوں کا اسلوب اور ان کے موضوعات کا مطالعہ کیا جائے گا۔ انشائیہ کے فن کو سامنے رکھتے ہوئے ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کے انشائیوں میں عصری شعور کا مطالعہ کیا جائے گا۔ ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کے انشائیوں کی نمایاں خصوصیات جو ان کو معاصر انشائیہ نگاروں سے منفرد کرتی ہیں ان کا جائزہ لیا جائے گا۔

اظہار تشکر

تمام تر حمد اس ذات بابرکت کی جو ہر عیب سے مبرا و منزا ہے۔ بعد از تحمید و تمہید یہ حقیقت ہے کہ بلاشبہ کہ تحقیق ایک ادق فن ہے لیکن انسان اگر خلوص دل اور لب صادق کے ساتھ اپنی خداداد صلاحیتوں کو روئے کارلا تے ہوئے اس کے لئے کوشش کرے تو یہ کام مشکل تو ہو سکتا ہے ناممکن نہیں۔

مقالہ لکھنا آسان کام نہیں۔ اس حوالے سے موضوع کا انتخاب سب سے ضروری ہوتا ہے۔ اس کے لئے میں اپنی نگران ڈاکٹر بشریٰ پروین صاحبہ کی بے حد ممنون ہوں جنھوں نے نہ صرف موضوع کے انتخاب میں مدد کی بلکہ ہر موڑ پر رہنمائی کی۔ ان کے ساتھ صفدر سلیم سیال اور ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جنھوں نے مقالہ لکھنے کے دوران میری مدد کی۔ اس کے ساتھ شعبہ اردو کے اساتذہ ڈاکٹر روبینہ شہناز، ڈاکٹر نعیم مظہر اور ڈاکٹر فوزیہ اسلم کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جن کی بدولت آج میں اس مقام تک پہنچی۔ میں اپنے والدین، بہن، بھائیوں، ڈاکٹر پلوشہ انور، بھائی مختار، حسین، بھائی غلام عباس، فریحہ اختر اور قمر عباس علوی، اورنگ زیب اختر کی سپاس گزار ہوں جن کی پر خلوص اور بے لوث دعاؤں نے مجھے اس ارادے کو عملی صورت فراہم کرنے کا حوصلہ بخشا۔

صوبیہ خان

باب اول:

عصری شعور اور اردو انشائیہ کی روایت

(الف) عصری شعور کیا ہے؟

عصر عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی زمانے کے ہیں اور شعور کے معنی آگہی، دانائی، عقل، سلیقہ، واقفیت، تمیز اور ہوش کے ہیں۔ عصر انگریزی لفظ (Contemperory) سے ماخوذ ہے جب کہ شعور (Awareness) کا متبادل ہے۔ عصری شعور کا مطلب اپنے عہد کے بارے واقفیت ہونا یعنی اپنے زمانے کے سیاسی، سماجی، معاشی حالات سے آگہی رکھنا۔ ہر عصر میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں اور ان رونما ہونے والی تبدیلیوں سے آگاہ رہنا ہے۔ ہر نیا عہد زندگی کو ایک انداز سے متاثر کرتا ہے۔ جیسے جیسے عصری سطح پر تبدیلیاں وقوع پزیر ہوتی ہیں۔ زندگی اور اس سے منسلک تمام امور زندگی بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہر عصر میں تغیر و تبدل ہر وقت جاری و ساری رہتا ہے اور زندگی کے نئے رخ متعین کرتا ہے۔

عصری شعور کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید یوں لکھتے ہیں:-

> "عصری شعور سے مراد کسی مخصوص عہد میں معاشرتی، تہذیبی، علمی اور فکری سطح پر رونما ہونے والے واقعات، افکار، اذکار اور انکشاف سے آگہی ہے۔"[1]

دورِ حاضر میں ہر چیز کی ماہیت کا اندازہ اس کی عصری اہمیت و افادیت سے لگایا جاتا ہے۔ عصریت میں چونکہ سیاست، معاشی ناہمواری اور ظلم واستبداد سر فہرست ہیں تو ہم ان ہی پہلوؤں کو عصری شعور کے مترادف سمجھنے لگتے ہیں جس کا نتیجہ ادب میں پراپوگینڈے کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ اسی طرح عصری مسائل کو عصری شعور کے بغیر سمجھ پانا مشکل ہے۔

عصری شعور روایت سے انحراف کا درس نہیں دیتا بلکہ یہ تو اس روایت کے تازہ اور زندہ عناصر کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ ادب کا تعلق ہر فکر فلسفے سے ہے۔ ہر وہ شے جو انسان اور انسانی معاشرے سے متعلق ہو گی وہ ادب کا حصہ بنی رہے گی۔ عصری شعور کا سب سے بڑا ذریعہ ادب ہے۔ اور ادیب ہر زمانے میں اپنے داخلی اور خارجی پہلوؤں پر نظر رکھتا ہے اور اپنے عصر کی زبان بن کر اس کی عکاسی کرتا ہے۔ ادیب ایک نسل کے تجربات و مشاہدات کو اگلی نسل تک پہچانے کا ذریعہ بنتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک لفظ ایک نسل کے تجربے کو دوسری نسل تک منتقل کرنے کا راستہ بنتا ہے اور ان الفاظ کو دوسری نسل تک پہنچانے کا ذریعہ ادیب ہوتا ہے۔ جس کی نظر معاشرے کے تمام پہلوؤں پر ہوتی ہے۔ اور ادیب ان پہلوؤں کی کھوج لگاتا ہے جو عام افراد کی نظر سے دور ہوتے ہیں۔

عصری شعور کے بغیر کوئی بھی ادب تخلیق نہیں کیا جا سکتا اپنے زمانے سے آگہی سے ہی تخلیق کی روح بیدار ہوتی ہے اور پھر صرف ایک رخ یا سمت کی پیروی نہیں کرتی بلکہ بے شمار رخوں کو ملا کر یکجا کر دیتی ہے۔ اس طرح ادب کی آواز ایک طرف اپنے دور کی ترجمانی و نمائندگی کرتی ہے تو دوسری طرف آنے والے دور کی آواز بن کر ابھرتی ہے۔

ڈاکٹر عزیز احمد شعور سے متعلق رقمطراز ہیں:۔

"شعور کے معنی آگہی، وقوف، علم و شعور کے ہیں۔ کسی چیز کی داخلی حیثیت، ذاتی وجود، حساسیات اور معلومات کا وقوف مجموعی طور پر ایک فرد یا عوام کے اوسط خیالات احساسات کا علم شعور کہلاتا ہے"[۲]

ادیب کا عصری شعور عام فرد کے عصری شعور سے مختلف ہوتا ہے۔ مگر ادیب اس کے اُلٹ عصری شعور کو تاریخ کا حصہ بناتا ہے اور آنے والے ادیبوں کے لئے محفوظ کر لیتا ہے۔ کیوں کہ یہ بات تو ناممکن ہے کہ کوئی ادیب عصری شعور سے خود کو لاتعلق رکھ کر کے ادب تخلیق کر سکے۔ پھر یہ کہ عصری مسائل کو محض باہر کی دنیا میں موجود سمجھنا بھی ٹھیک نہیں۔ کیوں کہ فرد کی ذات کے آئینے میں تو عصری شعور اپنے تمام مسائل اور آلام کے ساتھ منعکس ہوتا رہتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ عصری شعور میں جذباتی عدم وابستگی کسی نہ کسی حد تک ضروری ہے بصورت

دیگر ارد گرد گھومتی رہے گی۔ جو لوگ عصری مسائل کو روحانی اور جمالیاتی تجربے میں بدل دینے پر قادر ہوتے ہیں ان کے یہاں حقیقی عصر بہت کا عصر خود بہ خود پیدا ہو جاتا ہے۔

(ب) اردو انشائیہ کی روایت اور عصری شعور:۔

یہ بات حیران کن نظر آتی ہے کہ مختلف اصنافِ ادب کے ارتقا اور فروغ کا سلسلہ ادوار اور زمانوں کے ساتھ بھی منسلک ہوتا ہے۔ اردو ادب کا تجزیہ کیا جائے تو اس بات سے انکار نہیں کہ کچھ اصناف مخصوص دور میں ترقی کی منزلیں طے کرتی ہیں جیسا کہ اردو غزل کی روایت بہت پرانی ہے اور مضبوط بھی لیکن ترقی پسند تحریک کے عروج میں غزل کا ارتقا تھم سا گیا اور اس دور میں نظم کو زیادہ اہمیت ملی۔ ایک زمانے میں افسانے کی صنف صرف واقعات تک محدود تھی لیکن گزشتہ کچھ دہائیوں سے کہانی کا رخ تبدیل ہو گیا اور علامتی اور تجریدی افسانے کو زیادہ فروغ ملا اس نقطہ نظر کو مدِ نظر رکھیں تو یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اچھا انشائیہ ہر دور میں پیدا نہیں ہوتا۔ ہر چند انشائیہ آزاد ماحول کا تقاضا کرتا ہے اور یہ بات طے ہے کہ انشائیہ صرف اس دور میں پنپ سکتا ہے جب ماحول اور حالات سے فرد ایک شدید بے چینی کے احساس میں ہو۔

جہاں تک عصری شعور کے حوالے سے ادب کا تعلق ہے تو بیسویں صدی عیسوی میں مغربی تہذیب و ادب کے مشرقی تہذیب و ادب پر ان مٹ اثرات مرتب کیے۔ عصری شعور آغاز سے ہی اردو ادب کا حصہ رہا ہے خواہ وہ شاعری ہو یا نثر۔ ادب میں جہاں تراجم اور اخذ اکتساب سے کام لیا گیا وہاں مغربی اضاف ادب کو مشرق میں کشادہ دلی سے مروج کرانے کی کوشش بھی کی گئیں۔ شاعری میں آزاد نظم اور نثر میں انشائیہ اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

اردو ادب میں صنفِ انشائیہ کا باقاعدہ آغاز بیسوی صدی کی چھٹی دہائی میں ہوا۔ اس سے قبل ہندوستانی ادب کا جائزہ لیں تو یہ بات تو طے ہے کہ بیسوی صدی کے نصف اول تک ادب پر سیاست غالب رہتی۔ جس کے سبب چیدہ موضوعات اور مخصوص قسم کا ادب وجود میں آیا۔ جس میں آزاد خیالی کے بجائے ٹھوس تخلیقی زبان کے برعکس نپے تلے فقروں کا استعمال اور ذاتی اظہار کے بجائے انفرادی سوچ کا نفاذ شرط اول قرار پایا۔ صنف انشائیہ

چوں کہ اس ماحول کی متحمل نہیں تھی۔ اس لئے بیسوی صدی کے نصف اول کے اختتام پر جب گروہی اور اجتماعی نظریاتی فکر کا طلسم ٹوٹا تو انشائیہ ایک صنف کے طور پر سامنے آیا۔

آگے بڑھنے سے قبل لفظ انشائیہ کے متعلق چند باتیں کہنا موزوں ہو گا۔ لفظ انشائیہ انگریزی زبان کے لفظ "لائٹ ایسےٖ" یا "پرسنل ایسے" کا اردو متبادل ہے۔ مونتین نے اس کے لئے لفظ "اسائی" استعمال کیا۔ جس کی اصل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی یوں لکھتے ہیں۔

> "اسائی عربی لفظ "اسعی" کی فرانسیسی شکل ہے۔ دو الفاظ کوشش کے معنی و مفہوم واضح کرتے ہیں۔مانا جاتا ہے کہ لفظ "اسائی" یونانی زبان سے فرانسیسی زبان میں آیا مگر گمان غالب ہے کہ عربی لفظ "اسعی" اس کی اصل ہے"[۳]

تاہم یہ بات واضح ہے کہ (ایسے) نگاری کا آغاز فرانس کے ادیب مونتین کے ہاتھوں ہوا۔ انھوں نے اس کیلئے اسائی کا لفظ استعمال کیا۔ لیکن جب یہ صنف ادب انگریزی زبان میں مروج ہوئی تو اس کے لئے متبادل لفظ استعمال کیا گیا۔ تاہم بعد ازاں لفظ "ایسے" انگریزی زبان میں جملہ تحقیقی و تخلیقی اور تنقیدی مضامین کے لئے بھی استعمال کیا جانے لگا۔ لفظ "ایسے" سے متعلق بات کرتے ہوئے پیٹر ولیٹ کہتے ہیں کہ ایسے کا لفظ سب سے پہلے ایسے آغاز مونتین کے ضمن میں منظر عام پر آیا۔ اکابرین ادب کی آراء کے مطابق ایسے کی ابتدا فرانس کے ادیب مونتین کے ہاتھوں ہوئی۔ فرانسیسی ادب میں تو اسے فروغ نہ مل سکا تاہم انگریزی ادب میں اس کو پنپنے کے وسیع مواقع میسر آئے اور یہ سلسلہ بیکن، جوزف ایڈیسن، ڈاکٹر جانسن، چارس لیمب اور ورجینا وولف تک جا پہنچا ہے۔

انشائیہ نگاری کے ادبی مفہوم کو سمجھنے کے لئے مضمون نویسی کے معنی و مفہوم اور اقسام کو جاننا ضروری ہے۔ مضمون انگریزی لفظ "ایسے" کا متبادل ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی "قومی انگریزی اُردو لغت" میں "ایسے" کے درج ذیل معنی بیان کیے ہیں۔

"کاوش، سعی، کوشش، جہد، جواب، مضمون انشا، مضمون، تگ و تاز، تگ و دو، جانفشانی محنت، کوئی کام انجام دینے کے لئے کی گئی کوشش آزمائش، امتحان یا تجربہ، مختصر ادب پارہ، جس کا مقصد کسی خاص نکتے کا اثبات یا موضوع کی توضیح تعبیر ہو۔" (۴)

انشائیہ اردو ادب کی وہ حساس صنف ہے جس کی ابتدا انگریزی ادب میں ہوئی اور بیسوی صدی 40 کی دہائی تک اردو ادب تک پہنچی۔ یہ صنف اردو میں نئی تھی۔ 1940ء سے 1960ء تک کے عرصے میں اردو ادب میں متعدد انشائیے تحریر کیے گئے انشائیہ کے حوالے سے تین مکاتب فکر سامنے آتے ہیں ان میں مشکور حسین یاد، پروفیسر نظیر صدیقی اور ڈاکٹر وزیر آغا شامل ہیں۔

جدید اردو انشائیہ بیسویں صدی عیسوی کے چھٹے عشرے کا دین ہے۔ ہر چند بعض احباب اسے سر سید احمد خان کی کوشش کا ثمر اور چند احباب اسے ملا وجہی کے زمانے تک گھسٹنے کی کوشش کرتے ہیں تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اردو ادب میں سر سید کی عطا "مضمون نگاری" ہے جو مغرب میں ایڈیسن اور اسٹیل کا امتیاز ہے، گو سر سید کی تحاریر میں انشائیہ کے اجزا ڈھونڈے سے مل جاتے ہیں لیکن سر سید کے پیش نظر وہ صنف ادب ہر گز نہیں تھی جسے ڈاکٹر وزیر آغا نے اُردو زبان میں رواج دیا، سر سید کے سامنے ایک ٹھوس مقصد تھا، جو مسلمان قوم کو جدید علوم کی طرف راغب کرنے سے عبارت تھا، جس کے حصول کے لئے انہوں نے اُردو میں مضمون نگاری کو رواج دیا اور اس کے عملی نمونے پیش کر کے قوم کی موجودہ حالت کو بدلنے کی مقدور بھر کوشش کی۔

مونتین نے انشائیہ کے لئے لفظ اسائی برتا ہے جب کہ انگریزی زبان میں کا متبادل لفظ تجویز کیا گیا جو بعد ازاں تمام غیر افسانوی نثری اصناف کے لئے استعمال ہونے لگا جس کے باعث بیسویں صدی عیسوی کے انگریزی ادیبوں نے لفظ ایسے کے ساتھ "پرسنل" یا "لائٹ" کا سابقہ لگا کر اسے عام مضمون نگاری سے الگ صنف ادب کی حیثیت تفویض کی تاہم سر سید کے پیش نظر انگریزی زبان کی صنف ادب ایسے تھی جس کا اُردو متبادل "مضمون" ہے نہ کہ جس کی طرف ڈاکٹر وزیر آغا یوں اشارہ کرتے ہیں۔

"بعض لوگ اُردو انشائیے کے سلسلے میں سر سید احمد خان کا نام لیتے ہیں اور انہیں اُردو میں انشائیے کو متعارف کرانے والی اولین شخصیت قرر دیتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ سر سید نے اُردو میں "ایسے" کو متعارف کرایا تھا نہ کہ "لائٹ ایسے" کو جو اس سے بالکل مختلف ہے۔(۵)

سر سید اور ان کے رفقائے کار کی نثری کاوشوں کو انشائیہ قرار دینا انصاف سے بعید ہو گا کیوں کہ ان مضامین میں غیر رسمی طریقِ کار کے برعکس سنجیدہ مباحث اور مقصد کا غلبہ ہے جس کے باعث اسلوب کو خیال کے ابلاغ کی خاطر پس پشت ڈال دینے کی روش توانا نظر آتی ہے مزید بر آں ذاتی انکشاف کے برعکس خارجی حقائق کو منکشف کرنے کا رجحان غالب ہے جس کے باعث انہیں باقاعدہ انشائیہ نگار تسلیم کرتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

عہد سر سید کے بعد بیسویں صدی عیسوی میں ڈاکٹر محمد حسنین نے پرسنل ایسے کا متبادل لفظ "انشائیہ" اور ڈاکٹر اختر اورنیوری نے علی اکبر قاصد کے مجموعہ مضامین "ترنگ" کے دیباچہ میں "انشائیہ" کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن مذکورہ بالا مضامین بھی انشائیہ کی صف سے خارج ہیں۔ اس لیے اس بات کو تسلیم کرنے میں کوئی قباحت نہیں کہ انشائیہ کو بہ طور صنف ادب اُردو میں مروج کرانے کا اعزاز ڈاکٹر وزیر آغا کو حاصل ہے۔

ہر چند ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر وزیر آغا کی اولیت سے انکار کرتے ہوئے اس سے قبل انشائیہ کا وجود ثابت کرتے ہیں لیکن ڈاکٹر سلیم اختر کے اعتراض کی تردید خود ڈاکٹر وزیر آغا ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"میں نے خود کو کبھی انشائیے کا بانی نہیں کہا اور کہنا بھی نہیں چاہیے کہ پہلا انشائیہ تو آج سے کئی سو سال پہلے فرانس کے مونتین نے تخلیق کیا اور وہی اس صنف کا بانی ہے" (۶)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ انشائیہ کو صنف کے طور پر اُردو میں رواج دینے اور انشائیہ کے عملی نمونے پیش کرنے کا اعزاز ڈاکٹر وزیر آغا کو حاصل ہے اور وہی اُردو میں اس صنفِ ادب کے بنیاد گزار ہیں۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر ناصر عباس نیئر کی رائے خاصی اہمیت کی حامل ہے۔

"اُردو میں انشائیہ کے تصور سے حقیقت بننے کا سفر ڈاکٹر وزیر آغا کا مرہونِ منت ہے آج ہم اُردو انشائیے کی حدود اور مزاج کو لائٹ یا پرسنل ایسے کے انگریزی نقادوں کے حوالے کے

بغیر بڑے اعتماد کے ساتھ معرضِ بحث میں لاتے ہیں تو اس کے پیچھے ڈاکٹر وزیر آغا کی بصیرت انشائیہ کار فرما ہے۔"(۷)

بیسویں صدی عیسوی کی چھٹی دہائی میں ڈاکٹر وزیر آغا کی ان تھک کوشش سے اُردو ادب میں انشائیہ کی صنف کا با قاعدہ آغاز ہوا جس سے ان کے مخالف سر گرم ہو کر صنفِ انشائیہ پر انگشت نمائی کرنے لگے وزیر آغا کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے نہ صرف مخالفین کی آراء کو نا قابلِ اعتنا سمجھا بلکہ یہ دیسی صنفِ ادب کو اُردو جامہ پہنانے کی عملی کوشش بھی کی۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں کا اولین مجموعہ "خیال پارے" 1961ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوا جو 22 انشائیوں پر مشتمل ہے، اس کے بعد وزیر آغا کے مزید تین انشائی مجموعے "چوری سے یاری تک" 1966ء، "دوسرا کنارہ" 1982ء اور "سمندر اگر میرے اندر گرے" 1989ء میں منظر عام پر آئے، مذکورہ بالا چار مجموعوں اور "سمندر اگر میرے اندر گرے" کے بعد لکھے جانے والے انشائیوں کو کلیات کی صورت میں پہلے "پگ ڈنڈی سے روڈ رولر تک" اور بعد میں صرف "پگ ڈنڈی" کے نام سے یک جا کر دیا گیا ہے یوں مجموعی طور پر "پگ ڈنڈی" 83 انشائیوں کا مجموعہ ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں سے متعلق منور عثمانی یوں رائے دیتے ہیں:

"وزیر آغا کے انشائیوں میں اُن کی فکر اور مزاج کے سب پہلو اور عمر اور احساس کے تمام موسم گھل مل گئے ہیں اس طرح انشائیہ نکتہ آفرینی اور خطر رسانی ہی کا حامل نہیں رہا، انشائیہ نگار کی گزرتی ہوئی زندگی کا گہرا تناظر اور وسیع منظر بھی بن گیا ہے ان انشائیوں میں زینت کا ہر جزو اپنی ذات کے اعلان، ہر ذرہ اپنی کارکردگی کے انکشاف اور کیفیت اپنے رویے کے پورے ابلاغ کا ارادہ لیے ہوئے ہے۔ اگر ہم ان انشائیوں سے سرسری نہ گزریں تو اپنی یکساں ہم وار اور بے رنگ زندگی میں بھی ہر جا ایک جہانِ دیگر پائیں۔"(۸)

ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں کے پہلے مجموعہ "خیال پارے" کی اشاعت کے بعد دیگر اہل قلم بھی اس صنفِ ادب کی طرف متوجہ ہوئے جن میں سر فہرست راولپنڈی کے مشتاق قمر اور پروفیسر جمیل ہیں۔ مشتاق قمر کے انشائیوں کا ایک ہی مجموعہ "ہم ہیں مشتاق" جب کہ پروفیسر جمیل آذر کے انشائیوں کے تین مجموعے "شاخِ زیتون" "رت کے مہمان" اور "وقت اےئ وقت" جب کہ انشائی تنقید کا مجموعہ "انشائیہ اور انفرادی سوچ" ہیں۔

اس زمانہ میں ڈاکٹر وزیر آغا کا ادبی مجلہ "اوراق" لاہور جاری ہوا۔ جس نے انشائیہ کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا تاہم پروفیسر جمیل آذر کے بعد غلام جیلانی اصغر اور ڈاکٹر انور سدید نے انشائیہ نگاری کی طرف توجہ کی اور پرفیسر غلام جیلانی اصغر نے "نرم دم گفتگو" کے نام سے جب کہ ڈاکٹر انور سدید نے "ذکر اس پری وش کا" اور "آسمان میں پتنگیں" کے نام سے دو انشائی مجموعے شایع کیے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے نہ صرف کثیر تعداد میں انشایئے لکھے بلکہ انشائیہ کی تشریح و فہیم میں مضامین لکھنے میں بے حد فعال کردار ادا کیا یوں وہ اس نوخیز پودے کو بیسویں صدی کے آخر میں ایک تن آور درخت کا روپ دینے میں کامیاب ہو گئے اور وہ صنفِ ادب جسے مہمل خیال کیا جاتا تھا زور پکڑا اور مختصر عرصہ میں انشائیہ نگاروں کی کہکشاں وجود آ گی۔ جس کی طرف ڈاکٹر وزیر آغا ان الفاظ میں اشارہ کرتے ہیں۔

> "پھر سلیم آغا کو انشائیہ لکھنے کا خیال آیا اور جب اس کا پہلا انشائیہ "اوراق" میں چھپا تو انشائیہ کے میدان میں نہ صرف نئی پود کی آمد کا اعلامیہ تھا بلکہ اس سے یکا یک انشائیہ نگاری کی تحریک میں تازہ خون کی آمزش بھی ہو گئی۔"(۹)

اور نوجوان ادباء کے ساتھ منجھے ہوئے ادیب بھی انشائیہ نگاری کی طرف راغب ہو گئے جن میں کامل القادری، اکبر حمیدی، منشا یاد، حیدر قریشی، محمد اسد اللہ، رام لعل نابھوی، پرویز عالم، طارق جامی، جان کاشمیری، محمد اقبال انجم، انجم نیازی، محمد ہمایوں، سلمان بٹ، رشید گریجہ، رعنا تقی، اظہر ادیب، سعثہ خان، فرخ سعید رضوی، یونس بٹ، امکد طفیل، تقی حسین خسرو، حامد برگی، بشیر سیفی، راجہ ریاض الرحمن، خالد پرویز، شمیم ترمذی، جوگندر پال، ارشد میر اور غلام الثقلین نقوی اہم ہیں۔

درج بالا انشائیہ نگاروں نے انشائی مجموعے بھی شائع کیے جن میں اکبر حمیدی کے انشائی مجموعے "جزیرے کا سفر" " تتلی کے تعاقب میں "،" جھاڑیاں اور جگنو"،"دیواروں پہ اشتہار" اور "پہاڑ مجھے بلاتا ہے"، رام لعل نابھوری کا "آم کے آم"، انجم نیازی کا "آنکھیں اور سمندر"، محمد اسد اللہ کا "بوڑھے کے رول میں "حسرت کاسگنجوی کا "شگوفے "ارشد میر کا "موڈ"، محمد یونس بٹ کا "چاہ خنداں"، اقبال انکم کا "خوش بو کے قافلے "اور حامد برگی کا "بہ اندازِ دگر" قابل ذکر ہیں۔

اس کے بعد بدقسمتی سے "اوراق" کی اشاعت معطل ہونے کے باعث اس پر منفی اثر پڑتا ہے۔ ہم کچھ اخبارات اور رسائل نے اس طرف توجہ کی۔ جس سے یہ صنفِ ادب بیسویں صدی سے اکیسویں صدی کی طرف قدم لینے میں کام یاب ہو گئی جس سے نہ صرف نئے انشائیہ نگار سامنے آئے بلکہ انشائیوں کے مجموعوں کی تعداد میں اضافہ ہوا، نئے انشائیہ نگاروں میں انجم انصار، عبد القیوم، ناصر عباس نیر، خالد صدیق، منور عثمانی، مشتاق احمد، شاہد شیدائی، ڈاکٹر محبوب عالم، حنیف باوا، شفیع ہمدم، غلام شبیر رانا، فاروقی ندیم، مختار پارس، غفار پاشا، عامر عبد اللہ، تصدق حسین الم، سید تحسین گیلانی اور دیگر احباب خاص طور پر نمایاں ہیں۔اور انشائی مجموعوں میں عبد القیوم کا "خیالی پلاو"، ناصر عباس نیرؔ "چراغ آفریدم" منور عثمانی کا "فرنٹ سیٹ "حنیف باوا کا" دائروں سے باہر" شفیع ہمدم کے "رعنائی خیال "اور دھند"، مشتاق احمد کے "حسرتِ دید" اور بوڑھا شوہر" وغیرہ اہم ہیں۔

یوں تو انشائیہ سے محبت دھیرے دھیرے بڑھتی رہی لیکن مطالعہ کی کمی اور انشائیہ کے خدوخال سے متعلق وزیر آغا صاحب کے بعد واضح ہدایات اور رونمائی کے فقدان کے باعث بیسویں صدی سے زیادہ اکیسویں صدی میں سیاسی قلابازیوں کے لئے بے ہنگم ذکر واذکار اور معاشرے کی بیماریوں میں نشان دہی میں یکسانیت کی روقاری کو بے مزہ کرنے لگی ہے اور اس قسم کے انشائیہ نگار اصل انشائیے کی روح سے انحراف کر کے انشائیہ کو طنز و مزاح کی سطح پر لے آئے۔ جس سے انشائیہ کی وہ لذت کم ہوتی جا رہی ہے، جو ڈاکٹر وزیر آغا، مشتاق قمر، غلام جیلانی اصغر، انور سدید، سلیم آغا قزلباش وغیرہ کے انشائیوں کا خاصا ہے جس کی کشش اور جاذبیت نے دیگر انشائیہ نگاروں کو متوجہ کیا۔

اکیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں ڈاکٹر وزیر آغا اور اکبر حمیدی ایسے انشائیہ نگار مسافرِ رہِ عدم ہوئے اور غلام جیلانی اصغر جیسے انشائیہ نگاروں کے لکھنے کی رفتار سُست پڑ گئی جس سے انشائیہ کا مستقبل خطرناک نظر آنے لگا۔ مختصر ابیسویں صدی کا آخری نصف انشائیہ کی ابتداء اور اس کا سنہری دور کہلانے کا مستحق ہے۔ لیکن اکیسویں صدی میں اس صنف کو جلا بخشنے والوں کے امر ہو جانے کے باعث اس کی آب و تاب میں کمی آچکی ہے۔

2000ء میں جہاں کہنہ مشق انشائیہ نگاروں کے انشائیے منظرِ عام پر آئے وہاں کچھ نئے انشائیہ نگاروں نے بھی اپنے سفر کا آغاز کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انشائیہ کی صنف پر تنقیدی مضامین، تراجم اور کتب کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہا جس کی وجہ اس صنف کی داخلی ذرخیری اور صنفِ انشائیہ کے بدلتے ہوئے ادبی اور ثقافتی منظر نامے سے ہم آہنگ ہونا ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جوں جوں دُنیا ایک عالمی گاؤں کی شکل میں سمٹتی جارہی ہے انشائیے کو مزید مقبولیت اور فروغ ملتا جاے گا اور وہ چند اصناف جو اس نئی ادبی اور ثقافتی صورتِ حال میں اپنا وجود برقرار رکھنے میں کامیاب ہوں گی۔ انشائیہ ان میں سرِ فہرست ہو گا کیوں کہ فرد کی انفرادیت کا علم بردار ہے اور فرد کو انبوہ سے نکال کر الگ پہچان سے مزین کرتا ہے، آنے والے وقت میں جو معاشرتی نظام اُبھرے گا اس میں فرد کو اپنی شناخت اور انفرادیت کی بقا کی زیادہ ضرورت ہو گی، ایسے میں انشائیہ انسان کی اس ضرورت کی تکمیل کا تخلیقی وسیلہ بنے گا گویا انشائیے کا مستقبل روشن ہے۔

2000ء میں انشائیے کی آمد " اوراق" کے پینتیس (35) سالہ نمبر کے ذریعے ہوئی جس میں اُردو انشائیہ کے معتبر نقاد ڈاکٹر بشیر سیفی کا مضمون بہ عنوان " اوراق اور انشائیہ " شائع ہوا اس مضمون میں جہاں مُدیر اوراق ڈاکٹر وزیر آغا کی انشائیے کے ساتھ قلبی وابستگی کے حوالے سے بھی بات کی گئی وہاں انشائیے کے ضمن میں " اوراق " کی پینتیس سالہ خدمات کا بھی جایزہ لیا گیا، یہ اعتراف بھی کیا گیا کہ انشائیے کی ابتدا اور ارتقا کے سارے مراحل " اوراق " کی مساعی کے مرہون ہیں، ساتھ ہی گزشتہ پے نیتس برس میں انشائیے کی تحریک کا احوال اور ان سے وابستہ لوگوں کی خدمات اور ان کے فنِ انشائیہ نگاری پر سیر حاصل بحث بھی کی گئی، اس مضمون میں خواتین انشائیہ نگاروں

کے فن کو خاصی تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا" اوراق" کے مذکورہ شمارے میں ڈاکٹر بشیر سیفی کے اس مضمون کے ساتھ گیارہ تازہ انشائیے بھی شامل تھے۔

پہلا انشائیہ اکبر حمیدی کا "خالی گیراج" خاصے کی چیز تھا۔ اس انشائیے کے پہلے حصے میں خالی گیراج انشائیہ نگار کی اُس خواہش کا پرتو بن کر اُبھرا ہے جو اُس نے نئے گھر میں گیراج بناتے ہوئے ایک نئی گاڑی خریدنے کی صورت میں کی تھی۔ ناساز گار حالات کے باعث گاڑی خریدنے کی خواہش تو پوری نہ ہوئی لیکن گیراج محلے والوں کی گاڑیوں کے کام آنے لگا۔ انشائیے کا دوسرا حصہ انشائیہ نگار کی ذات سے متعلق ہے جب انشائیے کے مرکزی کردار کو جو ریٹائرڈ زندگی گزار رہا ہے، ایک خالی گیراج سمجھا جانے لگا اور لوگ اسے اپنی ضرورتوں کا ذریعہ گردانتے لگے، گویا اس انشائیہ میں فرد کی انفرادیت کی بقا کا سوال اُٹھایا گیا ہے۔

دوسرا انشائیہ حامد برگی کا "چھت" تھا۔ اس میں چھت کے توسط سے ہماری ثقافت کے بعض ایسے پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو منہدم ہو رہے ہیں۔ ساتھ ہی روایت کے مٹنے اور ایک نئی ثقافتی زندگی کی ابتداء سے جن مسائل کا شکار ہو رہے ہیں ان کا اظہار بھی خوبصورت پیرائے میں موجود ہے گویا یہ انشائیہ روایت اور جدیدیت کے ٹکراو سے پیدا ہونے والی نئی صورت حال کا انشائی تجزیہ ہے۔ حامد برگی کا ایک اور انشائیہ "کھلونے"، "ماہِ نو" میں شایع ہوا جس میں چند اور انشائیے بھی شامل تھے جو انشائیے کے معیار پر پورے نہیں اُترتے تھے۔

"اوراق" کا تیسرا اہم انشائیہ "قلم" تھا جس میں ناصر عباس نیر نے قلم سے وابستہ تمام مروج تصورات کی نفی کرتے ہوئے ایک پر اسرار شے قرار دیا جو ایک نئے جہانِ معنی کی بازیافت، سمت، شعور اور منتہائے تخلیق سے آشنا کرتی ہے اور انسان کے ظاہر باطن کو روشن بھی کرتی ہے۔ مصنف کی نظر میں قلم وہ چراغ ہے جسے تھام کر انسان "تو شب آفریدی، چراغ آفریدم" کا نعرہ مستانہ بلند کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

چوتھا انشائیہ مشتاق احمد کا "بوڑھا شوہر" تھا جس کا اہم پہلو یہ ہے کہ بوڑھے شوہر کے کردار کے ذریعے مشتاق احمد اس تہذیبی پس منظر تک اترتے ہیں جس میں معاشرہ مادری نظام کے زیر اثر تھا انھوں نے بوڑھے شوہر کی نیاز مندی، صلح جوئی اور نرم خوئی کے باعث اُسے قدیم مادری نظام کی یادگار قرار دیا ہے۔

حنیف باوا کا انشائیہ " پیپر ویٹ " بھی اسی شمارے میں شامل تھا جس میں پیپر ویٹ جو بظاہر عام سی شے دکھائی دیتا ہے ایک ایسی طلسماتی قوت کے طور پر اُبھرا ہے جو سمیٹنے اور مجتمع رکھنے کا فریضہ سر انجام دیتی ہے۔

یہ انشائیہ ایک سر براہ خاندان کی علامت بنا جو افراد خاندان کو باہم رکھتا اور خاندان کو بکھرنے سے بچاتا ہے۔ عبد القیوم کا انشائیہ " خیالی پلاو " اور مختار پارس کا " نہیں " بھی " اوراق " کے دو اہم انشائیے تھے۔ " خیالی پلاؤ" میں عبد القیوم نے خیالی پلاو پکانے کے عمل کو ایک ایسے رویے میں شامل ہوتے دیکھتا ہے تو اسے خیالی پلاو پکانے کا عمل تخریب لگتا ہے۔ اس انشائیہ میں تیسری دُنیا کے ممالک کے سیاسی منظر نامے کی تصویر کشی بھی کی گئی ہے جہاں ترقی کے منصوبے صرف خیالی پلاو ثابت ہوتے ہیں۔ مختار پارس نے اپنے انشائیے " نہیں " میں " نہیں " کو تمام تر اثبات کی بنیاد قرار دیا ہے۔ ان کی نظر میں " موجود " کی اہمیت " ناموجود " کے باعث اور " ہونے " کی توجیہہ " نہ ہونا " ہے۔ مختار پارس نے " نہیں " کی سحر آفرینی کو زندگی، انسان اور کائنات کے ظاہر و باطن میں ہمہ دم رقص کناں پایا ہے۔ درج بالا انشائیوں کے ساتھ محمد بصیر رضا کا " تانگہ " اور اے غفار پاشا کا " پیتل کا گھنگرو " بھی شائع ہوئے۔ " تانگہ " میں بصیر رضا نے تانگے کی سواری کو ایک رُوحانی اور تخلیقی تجربہ کے مماثل قرار دیا ہے جو تیز رفتاری کے عفریت سے چھٹکارا دلاتا اور تیز رفتار سے پھیلنے والے انتشار اور بکھراؤ سے بچا کر ارد گرد پھیلے ہوئے بے شمار مناظر سے مصافحہ اور معانقہ کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اے غفار پاشا نے " پیتل کے گھنگھرو " کے نئے نئے اوصاف اور انوکھے پہلوؤں سے روشناس کرایا ہے۔

" اوراق " کے اس شمارے سے قاضی اعجاز محور نے اپنے انشائیہ " کچھوا اور خرگوش " کے ذریعے انشائی سفر کا آغاز کیا، اس سفر کا آغاز کچھوے اور خرگوش کی روایتی کہانی ہے، روایت کے باطن سے تازہ معنی کی بازیافت ایک مشکل عمل ہے لیکن قاضی اعجاز محور نے یہ کام بخوبی انجام دیا ہے یہ پہلا انشائیہ ان میں تخلیقِ انشائیہ کے امکانات کی نشان دہی کرتا ہے۔ عامر عبد اللہ نے بھی اپنے انشائیہ " تنور " کے ذریعے سفر کی ابتداء اسی شمارے سے کی، پروفیسر شفیع ہمدم نے بھی اسی برس انشائیہ نگاری شروع کی۔

انشائیہ کے حوالے سے "نردبان" کے مارچ، اپریل اور اگست، ستمبر کے شمارے بھی بہت اہمیت کے حامل تھے۔ پہلے شمارے میں اُردو کے مستند انشائیہ نگار ڈاکٹر انور سدید کا انشائیہ "مطالعہ" شائع ہوا، انھوں نے خاصے عرصے بعد انشائیہ پیش کیا جس کا مطلب یہ ہے کہ انشائیہ کے ساتھ ان کی تخلیقی وابستگی بہ دستور قائم ہے۔ انھوں نے مطالعہ کی اہمیت کے متعدد پہلوؤں کو نشان زد کیا اور زندگی کی بے قرار اور بے ثباتی کی اہم وجہ "مطالعہ نہ کرنے" کی عادت کو قرار دیا۔ دوسرے شمارے میں پروفیسر جمیل آذر کا انٹرویو شائع ہوا جس میں نجمہ منصور اور عابد خورشید کے بعض نہاہت اہم سوالات کے جواب میں انھوں نے انشائیے کی ابتداء اور موجودہ صورتِ حال اور مستقبل میں اس کی اہمیت پر مدلل گفتگو کی۔ اس شمارے میں سلیم آغا قزلباش نے جان رسکن کے انشائیہ "گھاس کا ایک پت" کا ترجمہ پیش کیا: ترجمہ کا عمل نہایت مشکل کام ہے کیوں کہ ہر زبان جس ثقافتی نظام کے تحت ترتیب پاتی ہے وہ کسی بھی دوسرے ثقافتی نظام سے مختلف ہوتا ہے اور چوں کہ زبان کے الفاظ اور اُن سے وابستہ تصورات اپنے ثقافتی نظام کے اندر ہی بامعنی ہوتے ہیں، اس لیے ایک زبان کی تخلیق کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں کرتے ہوئے، تمام مخصوص تصورات کو جزئیات سمیٹ لانا کار دارد ہے تاہم سلیم آغا قزلباش نے یہ کام بہ خوبی انجام دیا ہے، وہ انشائیے کے باطن میں اُترے اور اُسے اُس اجنبیت کا شکار نہیں ہونے دیا جو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرتے وقت کسی بھی تخلیق کے اندر سما سکتی ہے۔ مغربی انشائیوں کے تراجم کرنا سلیم آغا قزلباش کا اقتصادی پہلو ہے۔

ڈاکٹر فہیم عظمی کے رسالہ "صریر" نے بھی 2000ء میں انشائیہ کو باقاعدہ جگہ دینا شروع کی دسمبر کے شمارے میں جمیل آذر کا انشائیہ "وقت اے وقت" شائع ہوا۔ جمیل آذر نے اس وقت انشائیہ لکھنا شروع کیا تھا جب بعض لوگ اسے صنف کے طور پر تسلیم بھی نہیں کرتے تھے۔ اب جب کہ یہ صنفِ ادب نہ صرف اپنے آپ کو منوا چکی ہے بل کہ اپنی انفرادیت کا اعتبار بھی مستحکم کر چکی ہے۔ جمیل آذر کا تازہ انشائیہ وقت کی تخلیقی اور تخریبی دونوں قوتوں کو دل کش انشائی اسلوب میں سامنے لاتا ہے۔

2000ء ہی میں "کاغذی پیرہن" کا اجراء ہوا جس کے نقشِ اولین ہی نے اپنی انفرادیت قایم کر لی اس پرچے نے بیسویں صدی کے اُردو ادب اور شاعری کے بارے میں سروے کرایا جو ادبی حلقوں میں آج بھی موضوعِ

بحث ہے۔ اس سروے میں جہاں ناول، افسانہ، سفر نامہ، تنقید، غزل، نظم، نثری نظم اور خود نوشت سے وابستہ شخصیات کے بارے میں رائے شماری کرائی گئی وہاں انشائیے کو بھی اس سروے میں شامل کیا گیا۔ سروے میں انشائیہ کی شمولیت اور بے شمار لوگوں کی رائے اس صنفِ ادب کے مقبولِ عام ہونے کا بین ثبوت ہے۔

"کاغذی پیرہن" کے اسی شمارے میں بصیر رضا کا انشائیہ "انتظار" اور شاہد شیدائی کا اولین انشائیہ "پہیہ" بھی منظر عام پر آئے جو معیاری انشائیے تھے۔ شاہد شیدائی کی انشائیے سے وابستگی ایک نیک شگون ہے وہ خود اور ان کا پرچہ انشائیہ کے فروغ میں فعل کردار ادا کر رہے ہیں۔

گزشتہ برس انشائیوں کی اشاعت کا سلسلہ نہ صرف ادبی پرچوں تک محدود رہا بلکہ انشائیوں کے مجموعے بھی شایع ہوئے۔ پہلی کتاب ناصر عباس نیر کی "چراغ آفریدم" ہے جو انشائیہ کے ضمن میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے اور صنفِ انشائیہ کی نئی کروٹوں اور نئی ابعاد کو سامنے لاتی ہے۔ ناصر عباس نیر کے انشائیوں سے متعلق عامر عبداللہ یوں رائے دیتے ہیں۔

> "ناصر عباس نیر کے انشائیوں میں زندگی کی گہری بصیرت موجود ہے ان کے انشائیے چار سمت پھیلی کائنات کے مقابل ایک نئی کائنات خلق کرنے کی خواہش کے پروردہ ہیں ان انشائیوں کو قرأت کے دوران میں انسان خارج میں پھیلی ہوئی کائنات اور اپنے اندر کی بے پناہ گہرائیوں میں محو سفر ہو جات ہے۔ "چراغ آفریدم" اُردو کے انشائیے کے ارتقائ کا پتا دیتی ہے۔ اہل نظر نے اسے جس توجہ اور پذیرائی سے نوازا وہ کم کم کتابوں کے حصے میں آتی ہے۔"[۱۰]

دوسری اہم کتاب انشائیوں کا انتخاب "سفر راستہ بناتا ہے" ہے جو اپنی طرز کا منفرد مجموعہ ہے اس میں صرف سفر کے حوالے سے انشائیے جمع کیے گئے ہیں ایک ہی پہلو یعنی سفر پر انشائیوں کا مجموعہ ہے اس کتاب کی ایک اور اہم بات منور عثمانی کا تحریر کردہ مقدمہ ہے جو اپنی جگہ ایک بھرپور انشائیہ ہے۔ اس مقدمے میں سفر اور

انشائیے کی مطابقت کو جس خوب صورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس سفر کے مروج تصورات منہدم ہو جاتے ہیں اور سفر ایک انوکھی واردات کی شکل میں اُبھر کر سامنے آتا ہے۔

اس برس انشائیے کی تخلیق کے علاوہ اس کی تنقید پر بھی خاصا کام ہوا اور انشائیے کو سنجیدہ نقادوں کی توجہ برابر حاصل رہی۔ اس ضمن میں ناصر عباس نیر کا مضمون "نئے انشائیہ نگاروں شعور تخلیق" مطبوعہ ادبیات " انشائیے کا تخلیقی عمل اور طنز و مزاح" اور ان کے انشائی مجموعہ "چراغ آفریدم" کا پیش لفظ کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جو ایک مضمون کا درجہ رکھتا ہے۔

"چراغ آفریدم" کے بارے ہی میں ڈاکٹر پرویز پروازی کا ایک اہم مضمون نومبر کے "صریر" میں شائع ہوا جس میں انھوں نے اُردو اور انگریزی انشائیہ کے پس منظر میں "چراغ آفریدم" کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا، اسی کتاب پر پروفیسر جمیل آذر نے 27 اگست کے روزنامی "نیشن" (اسلام آباد) میں ایک خیال افروز تبصرہ لکھا۔ "سفر راستہ بناتا ہے" پر عرفان جمیل کا تبصرہ "کاغذی پیرہن" میں شایع ہوا جس میں تبصرہ نگارہ نے اس موضوعاتی انتخاب کے انفرادی پہلوؤں کو اُجاگر کیا۔ دسمبر کے "نیرنگ خیال" میں محمد زبیر ٹیپو کا "اُردو انشائیے کے تین اہم نام" کے عنوان سے ایک دل چسپ مضمون شایع ہوا جس میں وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر اور اکبر حمیدی کے انشائیوں پر گفتگو کی گئی۔ اے غفار پاشا اور ڈاکٹر جاوید احمد جوئیہ کے پرچے "پارسا" نے تحریک تعیم انشائیہ کے نام سے ایک گوشہ مختص کیے رکھا اسی سال غفور شاہ قاسم کی کتاب "اُردو ادب شناخت کی نصف صدی" شایع ہوئی جس میں "اُردو انشائیے کے پچاس سال" پر ایک مضمون شامل کیا گیا۔

قصہ مختصر ایک برس کے مختصر عرصے میں اُردو انشائیے نے خاصی تیزی کے ساتھ سفر طے کیا تخلیقی اور تنقیدی دونوں سطحوں پر یہ صنف اہلِ نظر کی توجہ کا مرکز بنی رہی ہر چند کہ اس برس میں وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر، سلیم آغا قزلباش کے تازہ و انشائیے شامل نہیں ہوئے۔ تا ہم ان کی انشائی فکر اس برس کے انشائیوں میں موج زن رہی اور انھیں تنقیدی مضامین میں یاد رکھا گیا۔

انشائیہ اور عصری آگہی میں ڈاکٹر انور سدید یوں رقمطراز ہیں:

"انشائیہ کے جنم میں اس حقیقت کا عمل دخل زیادہ ہے کہ جب مونتین نے اپنے عصری شعور اور ذاتی تجربے کو زمانے کے سامنے آزاد خیالی سے پیش کرنے کا ارادہ کیا تو غیر منضبط تحریروں سے انشائیہ وجود میں آگیا۔۔۔۔اس دور میں مونتین نے ایسی تحریریں پیش کیں جن میں نہ صرف مونتین خود موجود تھا بلکہ ان تحریروں میں اس دور کا فرانس بھی سانس لے رہا تھا۔"(۱۱)

انشائیہ میں عصری شعور اپنے تصور کو جامع صورت میں نہیں لاتا بلکہ اس کا دائرہ کار ہر وقت گردش میں رہتا ہے۔ کبھی تو انشائیہ نگار اپنی ذات کے نکتے انکشاف سے زمانے کو گرفت میں لیتا ہے اور کبھی زمانے کے زینے سے ذات کے دروازے پر دستک دیتا ہے۔ دونوں صورتوں میں انشائیہ کسی ترش عمل کا بیان نہیں کرتا بلکہ زمانے کی خلوت میں داخل ہونے کے لیے ہمارے سامنے اپنی شخصیت کا در کھول دیتا ہے۔ اردو کے مختلف انشائیہ نگاروں نے بھی عصری شعور کو زاویوں سے پیش کرنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔

حوالہ جات

۱۔ انور سدید ،ڈاکٹر ،"ادب عصری آگہی او رانشائیہ"، مشمولہ ادبی زاویے، کل پاکستان اہل قلم کانفرس ۱۹۸۳کے مقالات کا مجموعہ اکادمی ادبیات، پاکستان، اسلام آباد، ص ۱۱۹

۲۔ عزیز احمد، ڈاکٹر، ترقی پسند ادب، کاروان ادب، ملتان، ۱۹۹۳ء، ص ۵۵

۳۔ ظہیر الدین، مدنی، ڈاکٹر، اُردو ایسیز، دیباچہ طبع دوم، دہلی، نومبر ۱۹۸۱ص ۹

۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی لغت، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۲۰۰۸ء

۵۔ شاہد شیدائی، عابد خورشید، نئے مکالمات، جمہوری پبلی کیشنز، لاہور، جولائی ۲۰۱۰ء

۶۔ ا یضا، ص ۱۹۷

۷۔ ناصر عباس نیئر، چراغ آفریدم، کاغذی پیرہن، لاہور، اپریل ۲۰۰۰ء، ص ۹

۸۔ رفیق سندیلوی، ڈاکٹر وزیر آغا شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۶ء، ص ۸۰

۹۔ اکبر حمیدی، مرتبہ، جدید اردو انشائیہ، مشمولہ: اردو انشائیہ کی کہانی، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ستمبر ۱۹۹۱ء، ص ۱۹

۱۰۔ کاغذی پیرہن، لاہور، ستمبر، اکتوبر، ۲۰۰۱ء، ص ۳۴

۱۱۔ محمد اسد اللہ، یہ ہے انشائیہ، سلمان فائن آرٹس مومن پورہ ناگپور، ممبئی، ۲۰۱۷ء، ص ۵۶

باب دوم:

ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کی انشائیہ نگاری

انشائیہ کی صنف بھی ناول افسانے اور تنقید کی طرح مغربی ادب کے ذریعے اردو میں آئی اور اسے بالعموم مضمون ہی کی ایک شکل سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نوعیت کے مضامین کو انشائیہ کا نام دیا جانے لگا۔ انشائیہ نگار موضوع کے بارے میں اپنے شخصی تجربات اور انفرادی تاثرات کچھ اس طرح پیش کرتا ہے کہ اس کی شخصیت کا کوئی چھپا ہوا گوشہ قارئین پر منکشف ہو جاتا ہے اور قائین انشائیہ کے موضوع کی بجائے انشائیہ نگاری میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ ڈاکٹر بشیر سیفی کے نزدیک ''انشائیہ'' مضمون سے قطعی مختلف ہے کیوں کہ مضمون میں کسی موضوع کو اس کے تمام تر علمی و فکری پہلوؤں کے ساتھ وضاحت سے پیش کیا جاتا ہے جب کہ انشائیہ میں طوالت کے بجائے اختصار کو اہمیت دی جاتی ہے۔

پروفیسر رفیع الدین ہاشمی نے ''انشائیہ'' کے بارے میں کچھ یوں اظہار خیال کیا ہے:

> "یہ نوخیز نثر انگریزی سے درآمد کی گئی ہے اور انگریزی ESSAY کی ایک شکل ہے موضوع کی ندرت اور تکنیک کی جدت کے اعتبار سے اردو کی تمام نثری اقسام سے بالکل مختلف ہے۔ اردو میں انشائیہ ایک جدید نثر کی حیثیت سے جس انداز میں ہمارے سامنے آیا اس کا انگریزی انشائیے کا موجد ایک فرانسیسی مصنف مونیتن ہے۔" (۱)

انشائیہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ اختصار سے کام لے تاکہ انشائیہ اپنی دلچسپی نہ کھو بیٹھے کیونکہ انشائیہ میں دلچسپی کا عنصر نہ ہونا یا کم ہونا انشائیہ کی خامی ہے بعض اوقات انشائیہ نگار دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے طنز و مزاح سے بھی کام لیتا ہے۔ انشائیہ میں طنز و مزاح کا داخلہ نہ تو ممنوع ہے اور نہ ہی ناگریز۔ یہ انشائیہ نگار کے مزاح اور اس کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ انشائیہ میں طنز و مزاح سے کام لیتا ہے یا نہیں تاہم اسلوب کی ان صفات سے کام لیتے ہوئے یہ احتیاط لازمی ہے کہ اگر طنز سے کام لیا جائے تو طنز کی نشریت کسی کی دل آزاری کا باعث نہ ہو اور اگر مزاح سے کام

لیا جائے تو مزاح تہذیب و شائستگی کے دائرے سے نکل کر پھکڑ پن کی حدود میں نہ لڑھک جائے انشائیہ کا مقصد نہ کسی کی دل آزاری ہے اور نہ کسی کا مضحکہ اڑانا ہے۔

اردو میں انشائیے کی آمد کو تین دہائیوں سے زائد عرصہ گزر چکا ہے انشائیہ کو بھی آزاد نظم کی طرح زبردست مخالفانہ رد عمل کا سامنا کرنا پڑا ہے مگر جس طرح آزاد نظم اپنی داخلی توانائی اور امکانات کے زور سے زمانے کی مقبول ترین صنفِ شعر قرار پائی ہے۔اسی طرح انشائیے نے بھی اپنی اندرونی قوتوں کے بل پر صنفی رد عملِ کی سخت چٹان کو اپنے فروغ ارتقاء کے راستے سے ہٹانے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔

ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش اردو اصناف میں جس صنف کو اولین توجہ کا مستحق سمجھا وہ انشائیہ ہی ہے۔ اردو ادب میں صنف انشائیہ کے بانی اور کثیر تعداد میں انشائیے لکھنے کے علاوہ اس پر تنقیدی تحریریں سپرد قلم کر کے دیگر اہل قلم کو اس کی طرف راغب کرنے اور اپنی زندگی میں ہی اس صنف کو بام عروج پر پہچانے والے ڈاکٹر وزیر آغا کے فر زند ہیں۔

انشائیہ جیسی مشکل صنف سے ان کی والہانہ محبت کا ثبوت یہ ہے کہ چوبیس سال کی عمر میں بارہ انشائیوں کا پہلا مجموعہ سرگوشیاں ۱۹۸۰ میں پیش کر کے اس نئی صنف کی زرخیزی کے متعلق متذبذب اہل قلم کے اذہان میں برا جمان روکاٹ کو دور کر دیا۔ سلیم آغا قزلباش نے افسانے بھی بڑے معرکے کے لکھے ہیں اور تنقید میں ان کی گرفت زیر قلم موضوع پر اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ پڑھ کر قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

(الف)ڈاکٹر آغا قزلباش کے انشائیوں کے موضوعات:۔

کوئی بھی ادب پارۂ، فن پارہ دواشیاء سے مل کر بنتا ہے۔ ایک موضوع اور دوسرا اسلوب ہے اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ کسی بھی فن پارے کے لیے اس کا موضوع بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ اسلوب کی اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن فن پارے کے موضوع کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ تمام اہل ادب جو ادب کی باریکیوں سے واقف ہوتے ہیں۔ وہ ادب پارے کے موضوعات سے حظ لیتے ہیں اور موضوع میں دلچسپی

کا اظہار بھی موضوع کی بنا پر ہی کرتے ہیں۔ اس لیے ادب پڑھنے والے عام قاری پر بھی پہلا تاثر موضوع کا ہی پڑتا ہے۔ افلاطون نے ادب کی مطالعے میں سب سے زیادہ اہمیت مواد کو دی ہے۔ ان میں مادی اور خارجی اشیا کا عکس جو اس کا موضوع ہے کس حد تک موجود ہے۔

موضوع کا تعلق زندگی سے ہوتا ہے۔ ادیب بدلتے ہوئے حالات وواقعات کو دیکھتا ہے او پھر اپنے اسالیب کے ذریعے قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اور موضوع جس قدر زندگی اور ارد گرد کے حالات سے قریب تر ہو گا تو وہ قاری کی دلچسپی کا باعث بنے گا۔ موضوع کے بغیر تو کسی بھی ادب پارے کا وجود ممکن ہی نہیں ہوتا۔ اس لیے ہر ادب پارے کے لیے موضوع کا ہونا لازم وملزوم امر ہے۔

موضوع کے بغیر کسی بھی فن پارے کی کوئی وقعت واہمیت نہیں ہوتی۔ موضوع کے بغیر فن پارہ قاری کے لیے دل چپسی کا باعث بنے یہ ناممکن بات ہے۔ کسی بھی فن پارے میں موضوع کا وجود ایک لازم امر ہے۔ ضروری نہیں کہ موضوع نمایاں، واضح اور شفاف ہو۔ فن پارے کے ہیتی تقاضوں، تکنیکی باریکیوں اور تخلیق کے اہداف و مقاصد کے تحت ہی اس کی صورت و شکل مرتب ہوتی ہے۔ فنی ڈھانچہ موضوع کی آزاد، غالب اور کلی حیثیت کو ختم کر کے اسے ایک پابند، محدود اور قابل گرفت شکل دیتا ہے۔ یہ تفصیلی عمل موضوع کی موت نہیں بلکہ زندگی کا ایک نیا روپ تصور موضوع سے ہی عاری نہیں ہوتا حتیٰ کہ ایسے فن پارے بھی جن میں کوئی موضوع نہ ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے بھی ایک موضوع رکھتے ہیں۔

ادب کے لیئے موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ ادب کوئی بھی ہو وہ کسی قوم کے نہ صرف حال کا عکاس ہوتا ہیں بلکہ اس کے ماضی کا بھی آئینہ دار ہوتا ہے۔ شروع سے لے کر اب تا کسی بھی ادب پارے میں جو بھی تبدیلیاں آئی میں کوئی بھی قوم جن جن گزر گاہوں سے گزری ہے۔ جس مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور اب تک کر رہے ہیں اور اس دوران کیسے کیسے نشیب و فراز آئے اور ان مخالفتوں کا جواب اس فکری اور تخلیقی سطح پر کس طرح دیا ان سوالات کے درست جوابات اسکی تاریخ کے علاوہ اس کے ادب میں بھی مل سکتے ہیں۔

ڈاکٹر احمر رفاعی موضوع کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

"ادب علم کی اس خاص صنف کا نام ہے جو اپنے موضوع، مواد اور اسلوب بیان کے لحاظ سے عوام و خاص کے لیے اپنی ایک دلچسپی رکھتی ہے جس میں تفریح کا عنصر ضرور شامل ہو۔" (۲)

سلیم آغا قزلباش کے انشائی سفر کو دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہے کہ انہوں نے بیسویں صدی کے آٹھویں عشرے میں انشائیہ نگاری کی طرف توجہ مبذول کی اور یہ زمانہ اردو انشائیہ کے عروج کا ہے۔ سلیم آغا قزلباش کے انشائیوں کا قدرے نمایاں پہلو موضوعات کا چناؤ ہے۔ ان کے انشائیوں کے موضوعات کو تین اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلی قسم غیر مرئی موضوعات کی ہے۔ جن میں عادات اور خصائل پر خامہ فرسائی کی ہے۔ اس نوعیت کے انشائیوں میں "شرافت" "بھول جانا" "خوش فہمی" "آمنا سامنا" "سرگوشیاں" "آنسو بہانا" "نام میں رکھا ہے۔"

دوسری قسم کے موضوعات معمولاتِ زندگی سے متعلق ہیں۔ جن میں "کان" "لباس" "زبان" "ہل" "چھتری" "گلی" "پسینہ" "انگلیاں" "غسل اور غسل خانے: ہیں۔

تیسری قسم داستانوی انداز کے حامل موضوعات کی ہے جن میں ایک دو تین "برگد" کھال کے صد رنگ "قصہ گردن کا ہیں۔ سلیم آغا کے انشائیوں سے متعلق جمیل آذر یوں لکھتے ہیں۔

"سلیم آغا کے انشائیوں میں جو چیز قدر مشترک ہے وہ اس کی موضوع کے ساتھ وابستگی جیسے وہ تجزباتی مشاہدے اور فن کارانہ غیر وابستگی کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ خیالات لطیف کی ننھی قندیلیں جگمگانے لگتی ہیں۔ ایک خیال دوسرے خیال کو جلا دیتا جاتا ہے۔ تا آنکہ وہ اپنے خیال کی آخری تیز وضع دکھاِ کر قاری کے خیال کی لو کو تیز کر دیتا ہے۔ جس سے اس کا ذہنی افق مزید کشادہ ہو جاتا ہے۔"سب سے پہلے وہ یہ دیکھتے کہ موضوع کی ممکنہ صورتیں اور جہتیں کیا ہیں۔۔۔ پھر وہ یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کا

موضوع کا معاملات خیر د شر سے کیا واسطہ اور رابطہ رکھتا ہے۔۔۔ پھر وہ موضوع کو اپنی ذات کے آئینے اور اپنی ذات کو موضوع کے احاطے میں رکھ کر دیکھتے ہیں۔ یہ متوالی سرگرمی کبھی اپنے بہاؤ کو الگ الگ رکھتی ہے اور کبھی (مذکورہ بالا) دیگر سرگرمیوں کی آب وتاب میں برقی رو کی مانند یہاں سے وہاں تک پھیل جاتی ہے۔۔۔ اپنے موضوع کے حیرت کدے میں داخل ہو کر ان کی آخری لیکن بڑی دل دلچسپی ا س کا عرفانی روپ دیکھنا ہے جو کبھی تو موضوع کے ہم راہ طویل سیاحت رفاقت کے بعد نظر آتا ہے اور کبھی محض "اتفاق" کے اندر سے پھوٹ کر اپنی موہنی صورت دکھا دیتا ہے۔" (۳)

کوئی بھی ادب پارہ چاہے وہ نظم ہو یا نثر اپنے عہد میں رونما ہونے واے حالات وواقعات کی اپنے فن پارے کے موضوعات میں تشریح وتوضیح کرتا ہے۔ ادب تغیر پذیر ہوتا ہے۔ عہد کے بعد عہد بدلتا ہے اس لیے موضوعات بھی بدلتے رہتے ہیں اور اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ پہلے والے موضوعات ختم ہو جائیں اور ان کی جگہ نئے موضوعات آجائیں بلکہ وقتی طور پر موضوعات ایک دوسرے کی جگہ لیتے ہیں۔ جس طرح زندگی ہر لمحہ بدلتی ہے اسی طرح ادب کے موضوعات میں بھی تبدیلیاں آنا اس کے زندہ وجاوید ہونے کی دلیل ہے۔

سلیم آغا کے تمام تر انشائیوں کے عنوان یک لفظی ہیں۔ انہوں نے زیادہ تر اشیاء کو موضوع بنایا ہے جب کہ وزیر آغا اور دوسرے انشائیہ نگاروں کے ہاں زیادہ تر کیفیتوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔

سلیم آغا نے عام سے موضوعات کو اپنے انشائی مجموعوں میں برتا ہے۔ "سرگوشیاں" کرنے والے حضرات کسی سے نہیں ڈرتے ہیں وہ ڈنکے کی چوٹ پر سرگوشیاں کرتے ہیں۔ یہ سرگوشیاں کرنا شور شرابے کرنے کے خلاف ایک احتجاج ہے، یہ سرگوشیاں کرنے والے لوگ ہمیشہ دوسرے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ "سرگوشیاں" سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

سر گوشیاں کرنا صنف نازک کا ایک پسندیدہ مشغلہ ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ "عورت چونکہ چار دیوواری میں گھری ہوتی ہے اور معاشرے کی پابندیوں کی وجہ سے اپنی نسوانیت کا اظہار کھل کر نہیں کر سکتی اس لیے وہ سر گوشیاں کرتی ہے۔"(۴)

عورتیں اکثر جن باتوں کو راز رکھنے کی قسم کھاتی ہیں۔ وہ اس پر پورا نہیں اتر پاتی اور وہ راز سر گوشیاں بن کر دوسروں کے کانوں میں ڈال دیتی ہیں اور پھر یوں وہ پورے گلی محلے بلکہ سارے شہر میں پھیل جاتا ہے۔ اسی طرح ایک اور موضوع جو سلیم آغا کی قلم کی زد میں آیا ہے وہ "برگد" ہے جو سب سے زیادہ اہم انشائیہ ہے۔ برگد کے متعلق سلیم آغا نے اچھوتی معنی آفرینی کی ہے وہ قابل داد ہے۔ اس سلسلے میں انشائیہ "برگد" میں سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"برگد اور انسان کا جنم جنم کا ساتھ ہے بلکہ مجھے تو یہ تک کہہ دینے میں میں تامل نہیں کہ انسانی تہذیب کا آغاز ہی برگد سے ہوا۔ ابتداً جب انسان پتھریلی غاروں میں زندگی بسر کرتا تھا تو اس کی فطرت میں بھی پتھر کی سی کرختگی پیدا ہو گئی تھی جب وہ پہلی مرتبہ برگد کے سائے میں جا بیٹھا تو اس قدر خوش ہوا کہ چلا چلا کر اپنے جیسے دوسرے لوگوں کو پکارنے لگا۔"(۶)

سلیم آغا قزلباش کا زیادہ تر وقت دیہی کلچر میں گزرا ہے۔ ان کے انشائیوں کے موضوعات بھی عام ہیں۔ روزمرہ کے معاملات زندگی میں جو اشیاء استعمال ہوتیں جن پر عام آدمی کی نظر نہیں پہنچ پائی ان اشیاء کو سلیم آغا نے اپنے انشائیوں کا موضوع بنایا ہے۔

انشائیہ نگار پھول کی پتی سے لے کر ستارے تک کو اپنا موضوع بنا سکتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ وہ انشائی رویے کو بروئے کار لا کر اپنے موضوع کی ایک نئی سطح دریافت کرے۔ انشائیہ نگاروں کے ہاں ساری تبدیلیاں موضوع کے سلسلے میں دکھائی دیتی ہیں ورنہ جہاں تک انشائی رویے کا تعلق ہے تو موضوع کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنا کہ اس کا چُھپا ہوا پہلو سامنے آ جائے۔ سلیم آغا قزلباش کے انشائیوں کی اہمیت اس بات میں ہے کہ اِنھوں نے بیسوی صدی اور

اکیسویں صدی کی سیاسی اور عمرانی فضا سے اخذ کردہ موضوعات کو بھی ایک انشائیہ نگار کی آنکھ سے دیکھا ہے اور اپنے نئے آنے والے انشائیہ نگاروں اور ہم عصروں کے لیے قابل تقلید مثال قائم کر دی ہے۔ سلیم آغا نہ صرف انشائیہ کی ابتدا میں ممتاز ہو جاتے ہیں بلکہ دیگر انشائیہ نگاروں نے برعکس اپنے انشائیہ میں اختصار سے کام نہیں لیتے بلکہ موضوع کے جملہ پہلوؤں کے انکشاف کی ممکنہ کوشش کرتے ہیں اور مخفی نکات کو سامنے لاتے ہیں جو کہ عام نظروں سے چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ جس سے انشائیہ طویل ہو جاتا ہے۔ ان کے برعکس دیگر انشائیہ نگار اختصار سے کام لیتے ہیں۔

کسی بھی موضوع کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لانے کا عمل مصنف کے وسیع مطالعہ کا ثبوت ہوتا ہے۔ اور سلیم آغا کا اپنے موضوعات کی ممکنہ جہات کو قارئین کے سامنے پیش کرنا ان کے وسیع مطالعہ ہونے کا ثبوت ہے۔ سلیم آغا انشائیہ نگاری میں خود کو مشرق و مغرب کے خانوں میں تقسیم نہیں کرتے بلکہ ایک علمی اور آفاقی انسان کی طرح موضوع کا جائزہ لیتے ہیں اور وہ مشرقی تہذیب کی عکاسی کے ساتھ مغربی تہذیب کی کمزوریوں سے بھی پردہ اٹھاتے نظر آتے ہیں مثلاً وہ انشائیہ غسل اور غسل خانے میں یوں لکھتے ہیں۔

> "کون نہیں جانتا کہ مغرب والے جب تک غسل سے بدکتے رہے تو ان کی ترقی کی رفتار بھی سست رہی لیکن جیسے ہی انہوں نے غسل خانوں کو رونق بخشنا شروع کر دی تو بدن کے ساتھ ساتھ ان کے اذہان کی یبوست بھی دھل گئی اور میل کچیل کی تہوں سے آزاد ہو کر ایسے چمکے کہ آج نہ صرف ہر طرف انہی کا صابن شیمپو اور تیل چل رہا ہے بلکہ پوری دنیا ان کے نقوش پر چلنے کی آرزومند دکھائی دیتی ہے۔"[۶]

سلیم آغا تہذیبِ مغرب کی خامیاں اور کمزوریاں ہی نہیں بتاتے بلکہ تہذیب مغرب کی خوبیوں اور عالمی کی مثالوں کو بھی پیش کرتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں انگریزی زبان کے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں جو الفاظ معمول کی گفتگو میں شامل ہوتے ہیں ان کو انشایئے کا موضوع بنا کر ان کو موقع محل کے مطابق استعمال کرتے ہیں انشائیہ ''ایک دو تین'' میں ڈرائنگ روم اور بیڈ روم کے فرق کو واضح کرتے ہیں۔

"ڈرائنگ روم اور بیڈ روم کے تصور نے دراصل اسی روز جنم لیا تھا جب انسان نے خود کو چار دیواری میں محصور کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ تہذیب و تمدن کے دائرے میں پاؤں رکھتے ہی اس نے اپنی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کر ڈالا۔ ان میں ایک حصہ اس کا سماجی یا خارجی روپ کہلایا جس نے خود کو ڈرائنگ روم کے روپ میں آشکار کیا جبکہ دوسرے حصے نے جو ایک طرح سے اس کا داخلی عکس تھا بیڈ روم کے لباس میں خود کو منکشف کیا گویا انسان کی ذات ڈرائنگ روم اور بیڈ روم کی دو اکائیوں میں پہلے دن ہی بٹ گئی تھی۔" (۷)

انشائیہ چونکہ بھاری بھر کم اور بوجھل تراکیب کا حاصل نہیں ہوتا اس لیے سلیس اور سادہ زبان کا استعمال ہی مناسب ہوتا ہے اور سلیم آغا نے انشائیہ کی زبان سادہ استعمال کی ہے۔

انشائیہ لباس میں یورپ کے معاشرے کی بے لباسی کی نوحہ خوانی کرتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ فیشن اور لباس کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ فیشن کا مزاج تبدیل ہوتے ہی لباس بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔

سلیم آغا کی بات کافی حد تک حقیقت پر مبنی ہے لیکن اس بات سے بھی قطعی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مغرب کی تقلید میں مشرق بھی کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ ہمارے معاشرے میں بھی مغربی لباس کے ساتھ ساتھ مغربی کلچر کو بھی پروان چڑھانے میں کافی سرگرم نظر آتے ہیں۔ اصناف ادب کی طرح ہمارا کلچر مغرب سے آہستہ آہستہ درآمد ہو رہا ہے بلکہ یوں کہہ لیں کہ مکمل اور علمی نمونے ہمارے سامنے آئے روز پیش ہو رہے ہیں۔

ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کے انشائیوں کے موضوعات نہ صرف بیسویں اور اکیسویں صدی کے حالات واقعات کی عکاسی کرتے ہیں بلکہ آنے والے دور میں بھی یہ انشائیے پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہو گا کہ ہم آج کے دور میں ہیں اور یہ ان کے انشائیوں کا بنیادی وصف ہے کہ ان کے انشائیوں میں سوچ اور فکر کے نئے افق طلوع ہوتے ہیں۔ موضوع کی گہرائی اور وسعت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک پہلودار شخصیت کا تقاضا کرتی ہے اور ساتھ ہی

ایک بڑے تہذیبی اور ثقافتی پس منظر نے بھی سلیم آغا کے ہاں نہ صرف روشن خیالی پیدا کی ہے بلکہ ان کے اظہار میں کھرا پن پیدا کر دیا ہے۔

"ناریل" جیسے خشک موضوع کو انشائیے میں دلچسپی اور نئے معانی سے آشنا کرنا مشکل کام تھا لیکن سلیم آغا نے بڑی خوبصورتی سے موضوع کو قاری کے لیے حیرت و حسرت کا ذریعہ بنا دیا ہے۔

"دیکھنے میں ناریل کچھ غیر جمالیاتی قسم کی چیز لگتا ہے بعض اوقات تو اس کا خارجی پیکر کسی نوعمر شرارتی لڑکے کے سر پر اُگے بالوں کا ایک ایسا ٹوکرا معلوم ہوتا ہے جو کنگھی قینچی کی دست برد سے ایک معقول مدت تک محفوظ ومامون رہا ہو بغیر کسی وقت ناریل کی شکل وصورت خاریشت کی بہ نسبت باسکٹ بال سے زیادہ ملنے لگتی ہے۔ مگر یہ باسکٹ بال کی طرح اندر سے خالی مغز نہیں ہوتا بلکہ اس کا اندر کافی پر مغز ہوتا ہے جسے عرف عام میں گری کہا جاتا ہے۔ اس گری کی ملائم اور شفاف سنگ مرمر ایسی مضبوط چاردیواری کے بیچ وبیچ ٹھنڈے میٹھے پانی کی ایک جھیل ہے جہاں سے پری زادو آدم زاد بلا اجازت اپنی پیاس بجھا سکتا ہے۔۔۔ اس لحاظ س ناریل کی گری انسانی کھوپڑی کا درجہ رکھتی ہے جس کے اندر اجتماعی لاشعور کا پانی بھرا رہتا ہے۔"(۸)

مندرجہ بالا اقتباس میں خوبصورت امثال اور معنویت اور نئے معانی سلیم آغا کے بے حد زرخیز ذہن نے اُبھارے ہیں جو ہر کسی انشائیہ نگار کے بس کی بات ہیں۔

اسی طرح انشائیہ بھول جانا میں سلیم آغا نے بڑی خوبصورتی سے مثبت اور منفی پہلوؤں کو اس طریقے سے سپرد قلم کیا ہے کہ بھول جانے کی منفی اور مثبت جہت ہو دونوں سے انسیت سی پیدا ہو جاتی ہے۔

ب) ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کے انشائیوں کا اسلوب:

اسلوب سبک اور سٹائل کا متبادل ہے۔ عربی میں سبک پگھلا دینے کو، ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کو کہتے ہیں اور سبیکہ پگھلی ہوئی چاندی کو کہتے ہیں۔ موجود دور کے ادیب سبک کو بطور مجاز نظم، نثر کی طرز کہتے ہیں۔ مغرب میں

اس کو سٹائل کہاجا تا ہے اور اردو میں اس کا متبادل لفظ اسلوب مستعمل ہے۔ادب کی اصطلاح میں اسلوب سے مراد اہل قلم کی سمجھ، سوچ، احساس اور شعور کا بیان ہے۔

اسلوب ایک ایسی پہچان ہے جس کے ذریعے شاعر یا نثر نگار اس کے ادراک، محرکات تخلیق کو سمجھتے ہیں۔ مختلف مکاتب فکر نے اس کی تعریف و توضیح مختلف طریقے سے کی ہے۔اس کی تعریف کے حوالے سے ادبی لغات اور مختلف اہل قلم رائے دیتے ہیں

فیروزاللغات کے مطابق:۔

"اسلوب (ع۔ا۔مذ) طریقہ کار۔طرز۔روش۔جمع۔اسالیب"(۹)

علمی اردو لغت میں:

"اسلوب (ع۔ا۔مذ)، طریقہ۔طرز، ڈھنگ، وضع۔انداز"۔(۱۰)

نوراللغات میں اسلوب کے معنی یوں ہیں:

"اسلوب (ع۔ا۔مذ) راہ، صورت، طرز، روش، طریقہ"۔(۱۱)

قومی انگریزی اردو لغت کے الفاظ یہ ہیں۔

"ادب میں موضوع سے زیادہ اسلوب پر زور دینے والا یا اس سے تعلق رکھنے والا کسی ادیب یا ادیبوں کے گروہ کا شناختیِ اسلوب فنون میں خارجی اسلوب انداز کوئی مخصوص طرز ادا"(۱۲)

مصنف، ماحول، موضوع، مقصد اور مخاطب اس حوالے سے Roland Barthes کہتا ہے۔

"گفتگو اور سٹائل میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ گفتگو کا انداز افقی ہے اس کے اسرار الفاظ کی سطح پر رہتے ہیں۔ گفتگو میں ہر شے اگل دی جاتی ہے تا کہ مطالب فوری طور پر مخاطب پر عیاں ہو

جائیں۔ دوسری طرف اسٹائل کا انداز عمودی ہوتا ہے۔ وہ مصنف کے اعماق میں زقند لگاتا ہے اور ایک ایسی حقیقت کی باز آفرینی سے عبارت نظر آیا ہے جو زبان کے لیے قطعاً اجنبی ہے۔ اسٹائل ایک استعارہ ہے جو مصنف کے باطن کو بے نقاب کرتا ہے۔" (۱۳)

ان تمام تعریفوں کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ کہ شخصیت کے تخلیقی پہلو کو اگر اسلوب کار کی شخصیت کا اظہار کہا جائے تو زیادہ بہتر ہو گا۔ اسلوب کے سلسلے میں فرانسیسی نقاد بوفون کا یہ جملہ بہت مشہور ہے کہ Style is the man himself جس طرح ماں باپ کا ناک نقشہ بچے تک منتقل ہوتا ہے اس طرح ادیب کا جبلی انداز فکر اس کا تخیل اس کے اسلوب میں داخل ہو جاتا ہے اسی لیے بوفون کا یہ قول اسٹائل شخصیت کا آئینہ دار ہے ادبی نہیں بلکہ حیاتیاتی سطح پر بھی درست ہے۔

اسلوب ایک ٹھوس شے کی مانند ہوتا ہے جسے دوسرے مواد میں ملا کر شکل دی جاتی ہے مندرجہ بالا تعریفوں کو مد نظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اسلوب ہر اس چیز کا نام ہے جس کے ذریعے ایک ادیب دوسرے ادیب سے منفرد نظر آتا ہے اور اس سے ہی ادیب کی پہچان ہوتی ہے۔

دیگر اصناف کی بہ نسبت انشائیہ کی تنظیم اس کے مختلف عناصر میں اس کے اسلوب سے گہری وابستگی رکھتی ہے۔ انشائیہ میں craftsmanship کے علاوہ شخصیت کا اظہار فطری طور پر راہ پاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں انشائیہ منفرد اسلوب میں نمودار ہوتا ہے۔ انشائیہ کے فن کی طرح اسلوب کا معاملہ بھی حد درجہ نازک ہوتا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں

"انشائیہ کے اسلوب میں جو لچک ملتی ہے اس کی بنا پر دیگر اصناف کے اسلوب سے بھی اس طرف استفادہ کیا جا سکتا ہے لیکن سلیقہ اور احتیاط کے ساتھ اس کی وجہ یہ ہے کہ ذرا سی بے احتیاطی وقتی چوک کے نتیجے میں انشائیہ کا اسلوب اس سے محروم ہو جائے گا، جو اس کا جوہر سمجھا جاتا ہے اور جس کے بغیر انشائیہ محض ایک روکھا پھیکا نثر پارہ بن کر رہ جاتا۔"(۱۴)

انشائیہ آج کا سب سے موثر ذریعہ اظہار ہے بلکہ یوں کہا جائے کہ انشائیہ مستقبل میں اظہار کا سب سے اعلیٰ اور مفید ذریعہ ہو گا تو اس میں ایسا کچھ غلط نہیں ہو گا۔ سلیم آغا کے انشائیوں میں سوچ اور فکر کے نئے افق طلوع ہوتے ہیں اور اچھے انشائیہ نگار کے ہاں دو باتوں کا ہونا بے حد ضروری ہے ایک یہ کہ اس کی شخصیت میں وسعت اور گہرائی ہو دوسرا اس کے انشایئے ایک بڑے تہذیبی اور ثقافتی پس منظر کو گرفت میں لیتے ہوں۔ یہ دونوں باتیں سلیم آغا کے ہاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ان کے انشایئے معمولی سی بات شروع ہو کر فکری طور پھیلتے چلے جاتے ہیں۔

جن لوگوں نے light Essay کی پیروی میں انشایئے لکھے ہیں۔ انہوں نے عنوانات کے سلسلے میں بھی مغرب کی پیروی کی ہے اور praise of msitakes یا sermans on shaving کے عنوانات استعمال کیے جاتے ہیں۔ سلیم آغا نے اس طرح کے عنوانات سے اجتناب برت کر شاید یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انشائیہ نگار کو توجہ مبذول کرانے والے عنوانات کی بجائے متن اور اس کے اسلوب پر انحصار کرنا چاہیئے۔ ان کے انشائیوں میں تفکر و تفنن کے علاوہ گہرا معنوی اسلوب بھی متاثر کرتا ہے۔ ان کے تینوں انشائی مجموعوں میں ایسے موضوعات پر بھی انشایئے لکھے گئے جن کو چھونے کی ہمت ایک محدود معلومات اور سطحی جذبات رکھنے والا عام آدمی نہیں کر سکتا ہے مثلاً بلبلہ، دھماکہ، ہل، سرگوشیاں، صدائے بازگشت، ناریل، پسینہ، آمنا سامنا، چوہے، قصہ گردن کا، کھال کے صدرنگ، اور نام میں کیا رکھا ہے۔ ان انشائیوں کے مطالعے سے باشعور دماغ اندازہ لگا سکتا ہے کہ سلیم آغا نے انوکھے عنوانات پر دلکش اور چونکا دینے والے انشائی اسلوب میں عام ڈگر سے ہٹ کر کتنے قابل قدر انشایئے تحریر کیے ہیں۔

سلیم آغا قزلباش کے انشائیوں کا اسلوب نہایت سادہ اور نفیس ہے۔ انہوں نے اپنے خیال تاثر اور احساس کے اظہار کے لیے بے حد سادہ لیکن نفیس اسلوب اختیار کر لیا ہے۔ کسی قسم کی ادبی آرائشی، اسلوبی، کھیل تماشے، عالمانہ رعب داب اور صبر آزما نامانوس لفظیات ان کی نثر میں کہیں نظر نہیں آتی۔ سلیم آغا کے انشائیوں کا وصف نہ صرف شگفتہ اور رواں اسلوب ہے بلکہ وہ سلیس اور آسان زبان کے ساتھ ساتھ سوچ اور فکر کا پہلو بھی نظر انداز

نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے انشایئے جہاں اسلوب کے حوالے سے کامیاب ہیں وہاں نکتہ آفرینی کا عنصر بہ طریق احسن خیال رکھتے ہیں۔

انشائیہ کے لیے ان کی کوششوں لائق تحسین ہیں۔ اس کے لیے انشائیوں پر ان کی لکھی گئی کتابیں مندرجہ ذیل ہیں:

- سرگوشیاں ۱۹۸۰ء
- آمنا سامنا ۱۹۸۷ء
- نام میں کیا رکھا ہے؟ ۲۰۰۵ء

یہ تینوں مجموعے موضوعات اور اسلوب کے حوالے سے بے مثال ہیں۔ انشائیہ جیسی لطیف مگر مشکل صنف ادب کو سلیم آغا نے اپنے اولین مجموعے "سرگوشیاں" اور اس کے بعد "آمنا سامنا" اور نام میں کیا رکھا ہے" میں ثابت کر دیا کہ تخلیقی شعور کی ضرورت ہوتی ہے۔

کسی بھی فن پارے کی بنیادی شرط تازگی ہوتی ہے۔ اگر اس میں تازگی نہیں تو وہ فن پارے چبائے ہوئے موضوعات الفاظ سے باہر نہیں نکل پاتا۔ اور پھر اس کے ہونے یا نہ ہونے کا جواز نہیں بنتا۔ سلیم آغا قزلباش کو یہ بات شروع سے ہی ازبر تھی کہ تازگی تخلیق کی روح ہے۔ اس لیے ان کا اسلوب دیگر انشائیہ نگاروں سے قدرے الگ ہے۔ وہ امکانات کی تلاش کے لیے تفتیش کا حربہ استعمال نہیں کرتے۔ ایک معیاری انشائیہ تحریر کرنے کے لیے انشائیہ نگار کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ عمیق ہونا بے حد ضروری ہے اس کا اندازہ ان کے انشائی مجموعے "سرگوشیاں" کا مطالعہ کرنے سے ہو جاتا ہے:

> "سرگوشیاں کرنا واویلے کے خلاف ایک مہذب سا احتجاج ہے۔ یہ فرد کو دھیمے انداز میں گفتگو کرنے کا گر سکھاتا ہے اور اب تو کبھی کبھی میرا جی چاہتا کہ اگر انسان بلند آواز میں باتیں کرنا ترک کر دے اور صرف سرگوشیوں میں اپنا مدعا بیاں کرے تو دنیا میں کہیں

وحشت اور بربریت کا مظاہرہ پیدا نہ ہو خون خرابے کی نوبت نہ آئے۔ نہ تلخ و ترش تبادلہ خیالات ہو اور نہ نفرت کی آگ پھیلے جب بات سرگوشی میں ہو گی تو قدرتی طور پر اس سے جذباتیت عنقا ہو جائے گیاور ہر معاملے پر سکون و قلب کے ساتھ غور فکر کرنے کی روایت وجود میں آئے گی۔" (۱۵)

سلیم آغا ہلکے پھلکے انداز میں گہری باتیں کر جاتے ہیں اور اس کی وجہ ان کی جزئیات نگاری ہے یعنی کم مطالعہ انشائیہ نگار زیادہ عرصہ تک انشائیہ جیسی لطیف لیکن مشکل صنف ادب میں ٹھہر نہیں سکتا۔ اس کے لیے مصنف کا مطالعہ وسیع اور نظر عمیق ہونی چاہئے اور شاید یہی وجہ ہے کہ انشائیہ لکھنے والوں کی تعداد باقی اصاف ادب لکھنے والوں کے مقابلے میں قدرے کم ہے۔

سلیم آغا قزلباش کے انشائیوں میں ان کے اسلوب کے منفرد اور الگ ہونے کی مثالیں ڈھونڈی جائیں تو جابجا ملتی ہیں۔

اسلوب کی ندرت اور تازگی کے ساتھ تیسری چیز جو سلیم آغا کے انشائیوں میں قدر نمایاں ہے وہ ہے بات سے بات پیدا کرنے کا ہنر ہے کہ وہ کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو اس کے داخل اور خارجی دونوں سطحوں پر فکری سفر جاری رکھتے ہیں۔ سلیم آغا کے انشائیوں میں عصری شعور انشائیوں کی ادبی تہہ میں سانس لیتا محسوس ہوتا ہے اگر کوئی فن پارہ تشبیہات استعارات علامت، اساطیر کے لبادے میں اگر اپنے عصر کی نمائندگی کا فریضہ سرانجام نہیں دے سکتا تو اس فن پارے کا فنی کمال تشنہ رہ جاتا ہے۔ سلیم آغا کا اسلوب سادہ مگر پر تاثیر ہے بظاہر سادہ لفظوں سے انہوں نے معنوی اسرار بیان کیے ہیں جملوں کی بندش لفظوں کی نشت وبرخاست پر انہیں قدرت حاصل ہے۔ یہ ان کے اسلوب کا کمال ہے کہ معنویت کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر جو موتی تلاش کرتے ہیں انہیں اتنی عمدگی اور سلیقے سے قاری تک پہنچاتے ہیں کہ وہ نہ صرف ان کی چمک دمک محسوس کرتا ہے بلکہ ان کی معنویت تک پہنچ جاتا ہے۔

ڈاکٹر سائرہ بتول اپنے مقالے میں لکھتی ہیں:

"ہر ادیب ایک خاص سطح کے قارئین کے لئے لکھتا ہے۔ اس سے کمتر اور برتر سطح کے شخص کے لئے اس کی تحریر میں کچھ نہیں ہوتا۔ یہ خاص سطح کا شخص کسی مخصوص ثقافت کی پیداوار ہوتا ہے۔ ادیب بھی اسی ثقافت کا حصہ ہوتا ہے۔ اسی حوالے سے وہ کچھ تحریر کر سکتا ہے۔ ہر تمدن اور ثقافت کے الفاظ، روزمرہ، محاورہ اور ضرب الامثال دوسری کسی بھی ثقافت سے مختلف ہوتے ہیں۔ ثقافت طبعی وجود، حالات رسوم و رواج، اعمال و وظائف کا ملغوبہ ہوتی ہے۔"(۱۶)

سلیم آغا کو انشائیے کی روایت وراثت میں ملی ہے۔ سلیم آغا کے انشائیوں کے عنوانات یک لفظی ہیں۔ ’’آمنا سامنا میں سنجیدگی، فلسفیانہ اور شگفتگی کے تال میل سے سولہ ایسے عمدہ انشائیے تخلیق کرنے میں کامیاب رہے اور یہ مجموعہ سب سے زیادہ گرانقدر انشائیوں کا مجموعہ ٹھہرتا ہے۔

انشائیہ ’’آمنا سامنا‘‘ میں مغربی مفکر پر ہربرٹ ریڈ کی اس بات سے سلیم آغا قزلباش نے روشنی حاصل کی ہے۔ سلیم آغا کے انشائیے پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ مزاحیہ اور طنزیہ اسلوب کو ااختیار کرتے ہوئے بھی نکتہ آفرینی انکشاف ذات یا کسی چیز کے مخفی پہلوؤں کو بھی بے نقاب کر سکتا ہے اور ان زاویوں اور گوشوں کو سامنے لاتے ہیں جو عام طور پر طنز و مزاح نگار کی آنکھوں سے اوجھل رہتے ہیں۔

اسی طرح انشائیہ بھول جانا میں سلیم آغا قزلباش نے بڑی خوبصورتی سے مثبت اور منفی زاویوں کو اس طریقے سے لکھا ہے کہ بھول جانے کی منفی جہت ہو یا مثبت دونوں سے لگاؤ سا ہو جاتا ہے۔ ذیل کے اقتباس میں یہ باتیں واضح ہو جاتی ہیں:

"بھولنا ایک نعمت غیر مترضہ ہے۔ ایک پاگل شخص کا سارا کرب اس میں ہے کہ وہ کسی مخصوص حادثہ یا واقعہ سے خود کو اس طور پیوست کر لیتا ہے کہ پھر اسے بھلا نہیں سکتا۔ جب ایک نارمل شخص کا مقدر وہ تیر نیم کش ہے جو کبھی بھی پار نہیں ہوتا۔ سو جب جلن

ختم ہوتی ہے اور زخم مندمل ہو جاتا ہے تو وہ گزشتہ راصلواۃ کہہ کر آپ کی جانب دوستی ویگانگت کا ہاتھ بڑھاتا ہے تا کہ اپنے تجربات میں مزید عبرت آموزابواب کا اضافہ کر سکے۔"(۱۷)

انشائیہ کی ذیل میں عمر کے مختلف مراحل میں انسانی فطرت میں دانائی اور چالاکی اور معصومیت کے تال میل سے سلیم آغانے انشائیہ کے مختلف ادوار کو بڑی احتیاط کے ساتھ اسلوب میں شامل کیاہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کے تمام مجموعوں کے انشائیے اپنی اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں۔

سلیم آغا قزلباش کے انشائیوں کی خوبی نہ صرف رواں اور سادہ اسلوب ہے۔ بلکہ وہ آسان زبان کے ساتھ سوچ اور فکر کا پہلو بھی نظر انداز کر دینے کے حامی نہیں ہیں۔ ان کے انشائیے جہاں پر اسلوب کے حوالے سے کامیاب ہیں وہاں نکتہ آفرینی بھی بطور خاص خیال رکھتے ہیں۔

"انسان اور چوہے کا رشتہ بہت پرانا ہے۔ اس قدر کہ چوہے نے آدمی سے اپنے تعلق خاطر کو قائم رکھنے کے لیے چنگیز خانی مونچھیں تک اُگاہ رکھی ہیں۔ البتہ چوہے اور آدمی کی مونچھوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ چوہا اپنی مونچھوں کو تاؤ دینے سے قاصر ہے جب کہ آدمی تاؤ دینے کا ماہر ہے۔"(۱۸)

سلیم آغا قزلباش کی انشائیہ نگاری کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اپنے انشائیے کی ابتدا مفروضہ نما جملے سے کرتے ہیں اور پھر اس کی تائید وتردید میں مختلف دلائل دیتے ہیں۔ اس طرح انشائیہ کے اولین جملے ہی سے قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ ایک طرف قاری تجسس میں مبتلا ہوتا ہے اور ساتھ ہی دلچسپی بھی لینے لگتا ہے۔ سیلم آغا قزلباش انشائیے کی ابتداء ایسے جاندار نداز میں کرتے ہیں کہ قاری پوری طرح ان کی تحریر گرفت میں آجاتا ہے۔

تینوں مجموعوں میں شامل اہل قلم کی آراسے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سلیم آغا قزلباش کے انشائیوں کے رنگ روپ، موضوع، اسلوب اور مواد میں مطابقت اور اچھوتے انشائی زاویوں سے کتنے احسن طریقے سے کام

لیا ہے۔ ان کے انشائیے پڑھ کر ہی اندازہ لگانا آسان ہو گیا ہے کہ یہ انشائی اسلوب یہ معنوی زرخیزی اور یہ مختلف نوعیت کے مواد پر عبور اس طرح قاری کو متاثر کرتا ہے کہ وہ لطف کی پھوار سے باہر نہیں نکل پاتا۔

ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کے انشائیے آزاد ترنگ کا عملی نمونہ ہیں۔ وہ گہرے خیالات کو شگفتہ اور لطیف الفاظ کا جامہ پہنا کر انشائیے کی شکل میں قارئین کے حضور پیش کرتے ہیں تو ان کے دلوں کو فروغت اور نگاہوں کو کشادگی عطا کرتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ رفیع الدین ہاشمی، اصنافِ ادب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۷۶ء ص ۱۵۶۔۱۵۹

۲۔ احمر رفاعی، ڈاکٹر، "ادب اور نقد ادب" ۲۰۰۱، ص ۲۵

۳۔ سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر "نام میں کیا رکھا ہے" کاغذی پیپر ہن لاہور، جنوری ۲۰۰۵، فلیب از جمیل آذر

۴۔ سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، "نام میں کیا رکھا ہے" کاغذی پیپر ہن، لاہور، ۲۰۰۵، ص ۴۴

۵۔ ایضاً، ص ۸

۶۔ ایضاً، ص ۴۴

۷۔ ایضاً، ص ۱۵

۸۔ ایضاً، ص ۶۹

۹۔ چراغ الدین، مولوی، فیروزاللغات" اردو جامع (نیا ایڈیشن) فیروز لمیٹڈ، لاہور

۱۰۔ وارث سرہندی، علمی اردو لغت "(جامع) علی کتاب خانہ لاہور، طبع، ۲۰۰۳ء

۱۱۔ نور الحسن نیرّ، مولوی، نوراللغات، (جلد اول، الف، ب) نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، طبع سوم۔ ۱۹۸۹

۱۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، "قومی اُردو لغت" مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع اول 1991ء

۱۳۔ فوزیہ اسلم، ڈاکٹر، "اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات"، پورب اکادمی اسلام آباد، طبع دوم، مئی ۲۰۱۰، ص ۶۸

۱۴۔ سیلم اختر، ڈاکٹر، "انشائیہ کی بنیاد" سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۲ء ص ۲۴۵

۱۵۔ سلیم آغا قزلباش،ڈاکٹر، سر گوشیاں مکتبہ اردو زبان سر گودھا۱۹۸۰ء ص۹۰

۱۶۔ سائرہ بتول ، ڈاکٹر، پاکستانی انشائیہ نگاروں کے اسالیب کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ۱۹۶۰ء تا حال، دسمبر ۲۰۱۲ء، ص ۸

۱۷۔ سلیم آغا قزلباش،ڈاکٹر ''آمنا سامنا'' مکتبہ فکر و خیال،لاہور ص ۲۰

۱۸۔ سلیم آغا قزلباش ''نام میں کیا رکھا ہے'' کاغذی پیپر ہن لاہور،۲۰۰۵،ص ۱۹

باب سوم:

ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش انشائیوں میں عصری شعور

الف) سرگوشیاں کے تناظر میں:

''سرگوشیاں'' ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کے انشائیوں کا پہلا مجموعہ ہے جو ۱۹۸۰ء میں مکتبہ اردو زبان سرگودھا زیر اہتمام شائع ہوا۔ اس کا فلیپ ڈاکٹر وحید قریشی اور بیک فلیپ سجاد نقوی کا مرقومہ ہے۔ اس مجموعے کا حرف اول مشتاق قمر نے لکھا ہے اور حرف آخر ڈاکٹر انور سدید نے تحریر کیا ہے۔

''سرگوشیاں'' سلیم آغا قزلباش کے انشائیوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس میں شامل انشائیوں کی تعداد بارہ ہے جِن کے عنوانات ''جال''، ''بلبلہ''، ''دھاکہ''، ''کرسی''، ''ہل''، ''چھتری''، ''آندھی''، ''آئینہ''، ''سمندر''، ''موم بتی''، "برگد" اور سرگوشیاں ہیں۔

سلیم آغا قزلباش کے انشائیوں کو پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ بیسویں عیسوی صدی کے آٹھویں عشرے میں انشائیہ نگاری کی طرف مائل ہوئے۔ اور یہی زمانہ انشائیے کے عروج کا بھی تھا اور صحیح معنوں میں اردو انشائیہ کا عہد زریں کہلاتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر، مشتاق قمر، ڈاکٹر انور سدید کے بعد انشائیہ نگاری میں نہ صرف سلیم آغا قزلباش کا نام مستند ہے بلکہ وہ انشائیہ نگاری میں نوجوان نسل کا استعارہ واعلامیہ بن کر وارد ہوئے۔ پروفیسر جمیل آذر انشائیہ کی صنف کے متعلق رقم طراز ہیں:

> "ہم کسی صنف ادب کو اُس کی قوم کے مزاج سے علیحدہ نہیں کر سکتے چونکہ آزادی فکر ہمارے مزاج میں ہے۔ اس لیے انشائیہ کا پاکستان میں نشوونما پانا فطری امر تھا۔ لہٰذا گزشتہ بیس سالوں میں اس صنف ادب نے حیرت انگیز ترقی کا مظاہرہ کیا۔" [1]

سلیم آغا قزلباش نے تمام زندہ اصناف ادب کے ہجوم میں آنکھ کھولی۔ ان کو اصناف ادب کے جدید ترین ماڈل ورثے میں ملے۔ تمام اضاف ادب میں سے انہوں نے انشائیے جیسی مشکل ترین صنف ادب سے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا۔

سلیم آغا نوجوان تھے اور ایم اے اردو کے طالب ہوتے ہوئے اس نو عمری میں کامیاب انشائیے لکھ کر ثابت کر دیا کہ شخصیت میں وسعت اور گہرائی ہو تو انشائیہ اتنی بھی مشکل صنف ادب نہیں ہے۔ سیلم آغا کے انشائیوں میں سوچ و فکر اپنے تہذیبی اور ثقافتی پس منظر سے پیدا ہوئی ہے۔ انھوں نے جس دیہاتی ماحول میں پرورش پائی اب اس کا پیش منظر بدل چکا ہے لیکن اس کا پس منظر نہ صرف زندہ ہے بلکہ اس نے پیش منظر کی تخلیق میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔

سلیم آغا قزلباش کے اب تک تین انشائی مجموعے بعنوان ''سرگوشیاں'' ''آمنا سامنا'' ''نام میں کیا رکھا ہے'' شائع ہو چکے ہیں۔ جب کہ ایک مجموعہ گرہ زیر طبع ہے۔ تمام انشائیوں کی تعداد چالیس ہے۔

اس مجموعہ کے حروف اول میں مشتاق قمر نے کچھ یوں رائے دی ہے۔

"سلیم آغا اپنی بات کا آغاز ایک معمولی اور غیر اہم نقطے سے کرتا ہے لگتا ہے وہ لمحاتی طور پر کسی ایک واقعہ سے متاثر ہو کر جذباتی انداز میں تاثرات کا اظہار کرنے چلا ہے لیکن جوں جوں آگے بڑھتا جاتا ہے۔ یہ معمولی غیر اہم نقطہ بے پناہ فکری وسعت اور گہرائی حاصل کر لیتا ہے لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ سلیم آغا صرف سوال ہی نہیں اٹھاتا ان کے جوابات بھی مہیا کرتا ہے مگر انتہائی تخلیقی انداز میں۔"[۲]

سلیم آغا قزلباش نے اس صنف ادب (انشائیہ) کو ام الاضاف کے طور پر قبول کیا ہے۔ انشائیہ میں سلیم آغا کی آمد سے انشائیہ وجودی طور پر بھی دوسری نسل کو منتقل ہو گیا۔ سلیم آغا نے جس ماحول میں پرورش پائی وہ انشائیہ کے مزاج کے عین مطابق تھا۔ ان کے انشائیے ''جال'' ''کرسی'' ''برگد'' ''سمندر'' پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے کم عمری میں گردو پیش کو بغور نظر دیکھا ہے۔

سلیم آغا قزلباش کے انشائیوں میں جو چیز قدر مشترک ہے وہ اس کی موضوع کے ساتھ وابستگی ہے۔ وہ اس وابستگی کو جب تجرباتی مشاہدہ اور فن کارانہ غیر وابستگی کے ساتھ پیش کرتے ہیں تو خیالات لطیف کی ننھی قندیلیں جگمگانے لگتی ہیں یوں قاری کے ذہنی افق کو مزید کشادہ کر دیتے ہیں۔ وہ نہایت خلوص اور محبت کے ساتھ اپنے مشاہدہ تجربے اور خیال میں شرکت کی دعوت دیتے ہیں اور یہ کیفیت ''جال'' سے لے کر سر گوشیاں تک رواں دواں نظر آتی ہیں۔ یہ تو حقیقت ہے کہ انسان ''جال'' سے کبھی باہر نہیں آسکتا۔ خودی کا جال آگہی کے تاروں سے تو بنتا ہے۔ جہالت کا جال چھوٹے تو علم ودانش کا جال آگھیر تا ہے۔ زندگی اور موت دو سفاک مچھیرے ہیں وہ اپنے اپنے جال پھینک کر ہر روز انسانی مچھلیاں پکڑ لیتے ہیں۔ یوں سلیم آغا ذات سے غیر ذات تک کا یہ فکری اور حسی سفر طے کر کے واپس اپنے وجود کے لمس کو محسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں 'مجھے احساس ہوا کہ پوری کائنات ایک سنہری جال میں اسیر ہے مگر سوال یہ ہے کہ زمان و مکان سے ستونوں سے بندھا ہوا یہ جال کس کے لیے ہے؟ کیا یہ سارا جال مجھے پھانسنے کے لیے ہے؟ کیا صرف مجھے؟ مگر سوال یہ ہے کہ زمان و مکان کے ستونوں سے بندھا ہوا یہ جال کس کے لیے؟ کیا یہ سارا جال مجھے پھانسنے کے لیے بنایا گیا ہے کیا صرف مجھے؟

سلیم آغا اپنے خیال کے جال اپنی ذات سے لے کر پوری کائنات کے اسرار تک پھیلاتے ج چلے جاتے ہے۔ اس سنہرے جال کی گرفت میں انفرادی، اجتماعی، معاشرتی و سماجی، اقتصادی، نفسیاتی سب ہی پہلو ایک ایک کر کے اس غیر معلوم کی طرح آئے چلے جاتے ہیں۔ ہمیں خیال تک بھی نہیں ہوتا اور وہ ہمارے سامنے ہلکے پھلکے انداز میں شگفتہ پیرائے میں کتنے ہی اہم نکات کا لامتناہی سلسلہ پیش کرتے ہیں۔

صرف ایک انشائیہ جال پر ہی منحصر نہیں ان کے تمام انشائیوں بالخصوص بلبلہ، دھماکہ، برگد، آئینہ، سمندر اور موم بتی میں عرفانِ ذات کا عنصر نمایاں ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی ''سر گوشیاں'' کے فلیپ میں سلیم آغا قزلباش کے انشائیوں کے متعلق یوں لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر وزیر آغا نے انشایئے کو مستقل صنف کے طور پر اختیار کیا اور ان کے زیر اثر انشائیہ نگاروں کا ایک مستقل گروہ بھی وجود میں آچکا ہے۔ جنہوں نے انشایئے کے ایک خاص طرز کو فروغ دیا۔ سلیم آغا بھی اسی دبستان فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں شہری اور دیہاتی دونوں فضاؤں کی جھلکیاں ملتی ہیں لیکن ان کا رنگ خاص موضوع کی ندرت نہیں بلکہ اسلوب کی جدت ہے۔ ان میں جزئیات کو پیش کرنے کی بے پناہ صلاحیت ہے۔ ہلکے پھلکے انداز میں گہری باتیں کہنے کا انھیں خاص ملکہ حاصل ہے۔ غیر اہم بات سے اہم بات کی طرف قاری کو آہستہ آہستہ لے جانے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔ سلیم آغا کے انشایئے حقِ وراثت کے ذیل میں نہیں آتے وہ تو جادو کی چھڑی سے اس میں طلسمی فضا کا بھی اضافہ کرتے ہیں۔ جن سے انشائیوں کا یہ مجموعہ اردو ادب کے لیے خاصے کی چیز ہو گیا ہے۔" (۳)

سلیم آغا قزلباش نے انشائیوں کے پس منظر کو اپنے آس پاس وقوع پزیر ہوتے دیکھا ہے۔ انشایئے کی ساری کشائش کو اپنے لاشعور کا حصہ بنایا ہے اور اس کے مزاج کو اپنی شخصیت میں اس طور جذب کیا ہے کہ ان کا تخلیق کردہ ہر انشائیہ بذات خود اردو کے لیے کسوٹی کا درجہ اختیار کر گیا ہے۔

سلیم آغا ایک مضمون کو ہزار رنگ میں نہیں باندھتے بلکہ انہوں نے موضوع کی بکھری ہوئی چند شعاعوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہر مرتبہ حقیقت کی ایک نئی کیفیت کو جنم دیتے ہیں۔ ان کا انشائیہ ''برگد'' سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"برگد اور انسان کا جنم جنم کا ساتھ ہے بلکہ مجھے تو یہ کہہ دینے میں تامل نہیں کہ انسانی تہذیب کا آغاز ہی برگد سے ہوا۔ ابتدا میں انسان پتھریلی غاروں میں زندگی بسر کرتا تھا تو اس کی فطرت میں پتھر سی کرختگی پیدا ہو گئی تھی، مگر جب وہ پہلی مرتبہ برگد کے سائے تلے جا کر بیٹھا تو اس قدر خوش ہوا کہ چلا چلا کر اپنے جیسے دوسرے لوگوں کو پکارنے لگا اور جب ان میں سے کئی اس کی آواز سن کر آئے اور برگد کے سائے تلے براجمان ہوئے تو انہیں ایک عجیب سے مسرت کا احساس ہوا۔" (۴)

برگد کا وجود ہر طبقے کے لیے ہر دور میں ایک خاص اہمیت کا حامل رہا ہے۔ حال ہو ماضی ہو یا پھر آنے والا مستقبل سب زمانوں میں اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔

اسی طرح ان کا انشائیہ چھتری میں چھتری کی اہمیت کا بیان کرتے ہیں کہ لوگوں نے خدا کی مقدس ہستی کو نیلی چھتری والے کا خطاب دیا ہے۔ چھتری کو دھوپ اور بارش سے محفوظ رہنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ انشائیہ چھتری میں دراصل چھتری ایک طلسمائی شے ہے کیوں کہ جب اسے بند کر کے اس کے گرد ڈوری لپیٹ دی جاتی ہے تو اس کی اگلی چونچ کسی نیزے کا مانند دکھائی دینے لگتی ہے اور جب اسے کھولیں تو یہ کسی قدیم زمانے کے جنگجو کی ڈھال بن جاتی ہے۔

بہر حال انسان کا یہ نفسیاتی مسئلہ ہے کہ وہ جس چیز سے شعوری یالاشعوری طور پر ڈرتا ہے تو اس سے بچاؤ کے لیے کوئی حفاظتی تدابیر ضرور کرتا ہے۔

اس طرح ''ہل'' ایک اہم انشائیہ ہے۔ سلیم آغا کی پرورشِ اور زیادہ وقت دیہی کلچر کے زیادہ قریب رہا ہے۔ اس لیے اس انشایئے میں سلیم آغا قزلباش نے اپنے تجربے اور مشاہدے کو زبان دی ہے۔ مختلف اشیاء جو انسانی زندگی میں آج تعیشیات کا درجہ رکھتی ہیں۔ کل ضروریات میں تبدیل ہو سکتی ہیں۔ علاوہ ازیں یہ تمام اشیاء انسان کے ساتھ ساتھ ہمیشہ نہیں رہتی بلکہ گزرئے ہوئے زمانے کے ساتھ پرانی ہو کر ضائع ہو جاتی ہیں۔ یا اپنی ہیت تبدیل کر لیتی ہیں لیکن کسان کا 'ہل' نہ صرف زمانے کے حوادث کا مقابلہ کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ اس میں اب تک کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی کسان کے قدموں سے قدم ملا کر زندگی کے لمبے سفر اس کا ہر دم ساتھ دے رہا ہے۔ سلیم آغا ''ہل'' میں زمین کی پاتال میں اترنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس طرح انشائیہ ''برگد'' اور '' چھتری''میں زمین پر آسمان بن کر روشنی اور سایہ بکھرتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح انشائیہ ''ہل'' اور ٹریکٹر کا موازنہ کچھ یوں کرتے ہیں۔

"جب سے ٹریکٹر نے ''ہل'' کے منصب کو ہتھیانے کی کوشش کی ہے۔ مجھے مشین سے خدا واسطے کا بیر ہو گیا ہے۔ میں کھیتوں میں جا کر ٹریکٹر کو 'ہل' چلاتا ہوا نہیں دیکھ سکتا کیوں کہ اس میں پیار و محبت کا فقدان ہے۔ اس کی بجائے رعونت اور غرور کی فراوانی ہے۔ ٹریکٹر کو کسی جنگلی جانور کی طرح غراتا ہے اور اپنے نوکیلے پنجوں سے دھرتی کا سینہ چیرتا چلا جاتا ہے۔ لیکن جن کھیتوں میں بیل کے ذریعے ''ہل'' چل رہا ہو وہاں مجھے یوں لگتا ہے جیسے ماں بچے کے پیر سے کانٹا نکال رہی ہے یا اُسے تھپک تھپک کر سلا رہی ہو۔" (۵)

اس اقتباس میں سلیم آغا نے کتنے خوبصورت انداز میں ''ہل'' کو ماں اور بچے سے تشبیہ دی ہے۔ پیار اور محبت کی ایسی عمدہ مثالیں ان کے انشائیوں میں جا بجا ملتی ہیں۔

اسی طرح انشائیہ ''کرسی'' میں انہوں نے بازار حیات سے بے لوث گزر جانے کے بجائے زمانہ کی تہہ میں اترنے کی سعی کی ہے۔ چنانچہ وہ واقعہ کو تجزیاتی انداز میں دیکھنے کی بہ جائے اس کے بطون میں اترتے ہیں۔ اور ہر واقع کو اپنے داخل کے تجزیاتی عمل سے نئی مصنویت عطا کرتے ہیں۔ بلاشبہ ڈاکٹر سلیم آغا کے ہاں انشائیہ کا موضوع بے حد اہم ہے۔ وہ موضوع کو ڈھیلا چھوڑتے ہیں۔ لیکن اس کی ڈوری ہمیشہ اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ موضوع ایک ایسا گیند ہے۔ جو سلیم آغا کے ہاتھ میں آتا ہے۔ تو وہ اس سے کھیلنے کی بہ جائے معاشرے کے آنگن میں پھینک دیتے ہیں۔ اور پھر اسے من عن قاری تک پہنچانے میں دیر نہیں کرتے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سلیم آغا حال کے تھڑکتے ڈولتے لمحے کی صرف ایک مرتبہ نہیں دیکھتے بلکہ لمحے کی ہر موج گزراں اس پر ایک نیا جہاں معنی آشکار کرتی ہے۔

اسی مجموعے کا ایک اور انشائیہ ''آئینہ'' ہے۔ جو حقیقت پسندی کی علامت ہے اور کبھی جھوٹ نہیں بولتا اور شے کو اس کی حقیقی صورت میں پیش کرتا ہے۔ آئینہ صرف خوبصورت شے کی خوبیاں ہی کو سامنے نہیں لاتا ہے بلکہ اس کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس کی کمزوریوں کو بے نقاب کرتا ہے:

"آئینہ آدمی کو دھوکہ بھی دیتا ہے۔ سکندر کو بھی اس آئینے نے دھوکہ دیا اور اسے ایسے ایسے سبز باغ دکھائے کہ اس نے ساری دنیا کو فتح کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ سکندر اپنی اسی حیرت انگریز ایجاد کے سحر میں خود ہی گرفتار ہو گیا اور اس کا انجام لیڈی آف شیلٹ کی طرح ہولناک موت پر فتح ہوا۔" (۶)

انشائیہ نگار ''آئینے'' کی اہمیت کو یوں جتلاتے ہیں کہ اگر آئینہ نہ ہوتا تو انسانی حیات میں صورت کے بہ جائے سیرت کو اہمیت دی جاتی۔

انسانی چہرے کو بھی وآئینے کے مماثل قراد دیا جاتا ہے۔ کیوں کہ چہرے سے باطن کی کیفیت منعکس ہوتی ہیں۔ انسان کے دل میں خوشی اور غمی کے جذبات بھی چہرے کے ذریعے ہی سے اظہار پاتے ہیں۔ میں جب کبھی ایسے آئینہ دیکھتا ہوں۔ جس میں کوئی ایسی کیمیائی رہ گئی ہو جس کی بنا ہر چہرے بگڑے ہوئے دکھائی دیں تو بڑی ہنسی آتی ہے۔ ایسے آئینوں کو دیکھ کر کسی سے لطیفے سننے، یا کوئی مزاحیہ فلم دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ آپ ایک ٹکٹ میں دو مزے آسانی لے سکتے ہیں۔

اسی طرح ایک اور انشائیہ ''کرسی'' میں یوں گویا ہیں:

"کرسی کو اس کا خانہ قدرت میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اس کرسی کی خاطر انسان نے کیا کچھ نہیں کیا۔ جنگیں لڑیں، خون بہایا، ریاکاری کی، سازشیں، فریب حربہ آزمایا مگر کرسی حاصل کرنے کی پیاس بجھنے میں ہی نہیں آرہی۔" (۷)

''کرسی'' کو عموماً اہل مغرب کی عطا خیال کیا جاتا ہے۔ مغرب والوں نے اس کو مشرق والوں کی اجتماعت کو ختم کرنے اور ان میں تفرقہ ڈالنے کے لیے متعارف کرایا تاکہ اس کے حصول کی جنگ میں ایک دوسرے کے جانی دشمن ہو جائیں علاوہ ازیں چارپائیاں یا پلنگ پر ایک وقت میں متعدد لوگ بیٹھ سکتے ہیں لیکن اس کرسی نے اس اجتماعیت کو ختم کر کے انفرادیت کو رواج دیا ہے حتیٰ کہ کھانے کے دوران بھی اتفاق واتحاد کی صورت برقرار نہیں رہی۔ اس کرسی کی خاطر پتہ نہیں اور کتنی معصوم جانیں قربان ہو گئیں ہیں۔

عصری شعور کے بغیر بڑا ادب تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔ اپنے زمانے اور اس کے شعور سے ہی تخلیق کی روح بیدار ہوتی ہے۔ یہ روح صرف زندگی کی یک رخی کی ترجمانی نہیں کرتی بلکہ اس میں لاتعداد رخوں کو سمیٹ کر اسے کچھ اور بنا دیتی ہے۔ اس لیے ہر ادب کی آواز ایک طرف اپنے دور کی اور دوسری طرف آنے والے دور کی آواز بن جاتی یعنی عصر حاضر کی آواز۔ ادب اور زندگی کا یہی رشتہ ہے جو واقعات سے نہیں بلکہ روح سے قائم ہوتا ہے۔

عصری شعور، عصری آگہی کے ذریعے لفظ ایک نسل کے تجربہ کو دوسری نسل میں منتقل کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کے انشائیوں کے مجموعہ سرگوشیاں ایک مکمل عہد کا احاطہ کرتا ہے۔ انہوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے ایک عہد کے سیاسی و سماجی حالات، نظریات، انداز فکر، شعور، علم و دانش کو دوسرے عہد تک پہنچانے کی بھرپور سعی کی ہے، اور کسی حد تک کامیاب بھی رہے ہیں۔

ب) آمنا سامنا کے تناظر میں:۔

"آمنا سامنا" ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کے انشائیوں کا دوسرا مجموعہ ہے جو جون ۱۹۸۷ء میں مکتبہ فکر و خیال لاہور کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ آمنا سامنا سلیم آغا قزلباش کے انشائیوں کا بیسویں صدی میں دوسرا مجموعہ ہے۔ اس میں شامل انشائیوں کی تعداد ۲۲ ہے۔ جن کے عنوان "صدائے بازگشت"، "ناریل"، بھول جانا"، "زبان"، "خوش فہمی"، "پسینہ"، "انگلیا ں"، "بادل"، "نعمت خانہ"، "سورج"، " مقناطیس"، "آمنا سامنا" "جنگل" کاغذی ہے۔ "پیرہن"، "دوربین"، "گلی"، "جالی"، "بلبلہ"، "کرسی"، "ہل چلانا"، ' 'موم بتی"، " دھاکہ" ہیں۔

سلیم آغا کے انشائیوں کا قدرے نمایاں پہلو موضوعات کا انتخاب ہے۔ ان کے انشائیوں کے موضوعات کو تین اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

سیلم آغا قزلباش کے انشائیوں کے دوسرے مجموعے ''آمنا سامنا'' میں ہی زیادہ تر یک لفظی عنوان کے انشائیوں کی تعداد غالب ہے۔ ان کے انشائیوں میں تفکر و تفنن کے علاوہ گہرا معنوی اسلوب بھی متاثر کرتا ہے۔ سولہ انشائیوں میں سے اکثر قاری کو اپنی معنوی اور موضوع کی مختلف جہتوں سے گرفت رکھنے کی قوت سے مالا مال بھی ہیں تاہم یہاں کہنا شاید بے جانہ ہو گا کہ تینوں انشائی مجموعوں میں ایسے موضوعات پر بھی انشائیے لکھے گئے ہیں۔ جن کو چھونے کی ہمت ایک محدود معلومات اور سطحی احساسات اور جذبات رکھنے والا انشائیہ نگار بمشکل کر سکتا ہے مثلاً بلبلہ، دھماکہ،،ہل (سرگوشیاں)، صدائے بازگشت، ناریل، پسینہ (آمنا سامنا) چوہے۔ قصہ گردن کا، کھال کے صدر رنگ (نام میں کیا رکھا ہے) ان انشائیوں کے مطالعے سے، باشعور انشائیہ نگار اندازہ کر سکتا ہے کہ سیلم آغا قزلباش نے مذکورہ انوکھے عنوانات پر دلکش اور چونکا دینے والے انشائی اسلوب میں عام ڈگر سے ہٹ کر کتنے قابل قدر انشائیے تحریر کیسے ہیں۔ حقیقت تو یہ کہ انشائیہ واحد صنف ادب ہے جو ہر موضوع کا خارجی پہلوؤں کی نقاب کشائی کر کے قاری کو حیرت و اضطراب کے عالم میں پہنچا دیتا ہے۔ سلیم آغا کے انشائیے فن کی خوبیوں سے بھرپور ہیں۔ ان کے ہاں عموماً مختصر انشائیوں کا رجحان ملتا ہے۔ بات کو بے تکلفی اور شگفتہ بیانی کے ساتھ بیان کرنا ان کے فن کا خاصا ہے۔ وہ نہایت سادہ اور رواں زبان استعمال کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کے انشائیوں میں دلچسپی کا ساماں بے حد نمایاں ہے جو کہ پڑھنے والے کو شروع ہی سے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ سلیم آغا کے انشائیوں کی خصوصیت ہے کہ وہ جس عنوان سے اپنے انشائیوں کو متعارف کرواتے ہیں ان کے انشائیوں کی تمام تر گفتگو اپنے عنوان اور موضوع کے گرد گھومتی ہے۔ اس حوالے سے وہ اپنی دلیل کو مستحکم بنانے کے لیے ایسے شواہد کو بھی پیش کرتے ہیں جو حقیقت و منطق کے عین مطابق ہوتے ہیں۔ سلیم آغا کا انداز بیاں دوستانہ ماحول کی طرح کا ہوتا ہے اور پھر اس طرح کی گفتگو ان کے انشائیوں میں ملتی ہے جو کہ باشعور اور اہل سمجھ لوگوں کا طرہ امتیاز ہوتی ہے۔

ہر لکھاری اپنے معاشرے، تہذیب و ثقافت کا ترجمان ہوتا ہے۔ ان کی تحریروں پر اس کے عہد کی چھاپ ہوتی ہے۔ سلیم آغا دور حاضر کے اہم ترین انشائیہ نگار ہیں۔ انھوں نے اپنے انشائیوں میں اپنے عہد کے حالات و واقعات کو سمویا ہے۔ ایک باشعور انشائیہ نگار ہونے کی غرض سے انھوں نے اپنے زمانے میں رونما ہونے والے

واقعات کو ہو بہو نہیں پیش کر دیا بلکہ انھوں نے ہر واقعے کو ایک باشعور، فلسفی اور صاحب بصیرت انسان کی طرح دیکھا ہے۔ اس کے بعد اس کا نتیجہ نکال کر اسے فن کا جامعہ پہنایا ہے۔ سلیم آغا نے ایسے انشائیوں میں اپنے عہد کے حالات وواقعات کو کس طرح سمویا ہے اس حوالے سے ان کی کتاب ''آمنا سامنا'' میں مشمولہ انشائیوں کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

''آمنا سامنا'' میں مشمولہ پہلا انشائیہ صدائے بازگشت کے نام سے ہے۔ انشائیہ کا عنوان بھی اچھوتا اور دلچسپ ہے۔ صدائے بازگشت یعنی دوبارہ سنائی دینے والی آواز سلیم آغا نے اس انشائیہ میں نہایت بے تکلف اور سادہ زبان استعمال کی ہے جو پڑھنے والے کو شروع ہی سے اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اپنے موضوع کو مستحکم بنانے کے لیے سلیم آغا نے مختلف دلیلوں اور شواہد کو بیان کیا ہے جو کہ ان کے نکتہ نظر کی دلالت کرتے ہیں۔

دور حاضر میں انسان نے بے پناہ ترقی کر لی ہے وہ باتیں جو اس کے لیے خواب ہوا کرتی تھیں اس کو انسان نے حقیقت بنالیا ہے۔ اس نے چاند ستاروں تک اڑان بھری ہے۔ ترقی کے نت نئے سامان مہیا ہو رہے ہیں۔ انسان ترقی کی راہوں میں بے حد دور نکل چکا ہے مگر انسان اپنے اندر کی ذات سے بالکل بے خبر ہو تا جارہا ہے۔ اس مادی ترقی نے انسان کو معنویت کی طرف دھکیل دیا ہے۔ مادی ترقی میں انسان اس قدم مشغول ہو چکا ہے کہ اس کے اندر روحانی جذبات مرتے چلے جاتے ہیں اور لوگ اپنے اندر میں بننے والی ذات سے بالکل نا آشنا ہوتے جارہے ہیں۔ انسان کے اندر بسنے والی یہ ذات ہمہ وقت انسان سے محو کلام رہتی ہے مگر مادیت نے انسان کو اس قدر بہرہ کر دیا ہے کہ وہ اپنے اندر سے اٹھنے والی آواز کو سننے سے قاصر ہو تا جارہا ہے بقول سلیم آغا:

> "فی الحال آدمی خود اپنی تلاش میں سرگرداں ہے اور اس تلاش نے اسے در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیا ہے لیکن یہ باز پھر بھی نہیں آیا، الٹا جب اسے ارض پر اپنا آپ نہ مل سکا تو اس نے فلک کی طرف اڑان بھری اور اب یہ خلا کے اندر خود کو ڈھونڈ رہا ہے۔ وہ کتنا بھولا ہے، اسے اتنا بھی علم نہیں کہ یہ سارا جہاں شور شر با اور یہ ساری خلق خدا اس صدائے

باز گشت کا ایک روپ ہے جو کہ صدا کن کے جواب میں نمودار ہوئی تھی لیکن جو آج تک بے آواز ہے۔"(۸)

"آمنا سامنا" میں دوسرا انشائیہ "ناریل" کے نام سے ہے۔ جس میں انھوں نے ناریل کے موضوع سے اپنی گفتگو کو آگے بڑھایا ہے۔ انشائیے کا مقصد اصلاحی پہلو پر منحصر ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کو فطرت سے قربت رکھنی چاہیے۔ انسان نے اپنی آرائش و تفریح کے لیے طرح طرح کی اشیاء بنائی ہیں۔ آرائش و تفریح کے اس سامان میں جدت نہ صرف رہنے سہنے کی حد تک آئی ہے بلکہ طرح طرح کے کھانے بھی تیار ہونے لگے۔ یہ معنویت کبھی بھی فطرت سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ فطرت ہی انسان کی روح کی غذا ہے۔ فطرت سے انسان کی روگردانی خود اس کی ذات کے لیے مضر ہے۔ اس بات کا اظہار سلیم آغا طنز و مزاح کے روپ میں کرتے ہیں:

"بھلا ناریل کے ہوتے ہوئے ان ریڈی میڈ کھانوں کی کیا ضرورت۔ ناریل تو بیک وقت ماکولات میں بھی شامل ہے اور مشروبات میں بھی۔ اس چیز نے اسے دودھاری تلوار بنا دیا ہے۔ پھر آج کل کے تیز زمانے میں ٹفن کیرئر، واٹر کولر، یا تھرماس وغیرہ اٹھائے لٹکائے پھرنا بھلا کہاں کی دانشمندی ہے۔ ناریل ان تمام پر آشوب چیزوں سے گلو خلاصی کا اکلوتا حل ہے۔"(۹)

"بھول جانا" ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کا اہم ترین انشائیہ ہے۔ جس میں انھوں نے نفسیاتی بھولنے کے عمل کو موضع گفتگو بنایا ہے۔ عام طور پر ہمارے معاشرے میں بھولنا ایک بیماری سمجھی جاتی ہے کیونکہ روزمرہ کے معمولات میں اس کی وجہ سے کافی دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ آغا سلیم نے اس نفسیاتی پہلو کو بڑے فلسفیانہ اور عالمانہ انداز میں بیان کر کے اس کے مثبت پہلو پر روشنی ڈالی ہے کہ بھول جانے کا عمل ہر چند دنیاوی معمولات میں دشواریاں پیدا کرتا ہے مگر اس سے انسانی ذہن پر مثبت اثرات بھی پڑتے ہیں۔ بلاشبہ کتھارسس کے بعد جب بھول جانے کا عمل شروع ہوتا ہے تو انسان پر اس کے فائدہ مند اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

انسانی معاشرے میں نفرت اور دشمنی کا سبب بھی بھولنے کے عمل کی وجہ سے ہے۔ اگر ہم کسی سے ملی ہوئی نفرت یا زیادتی کو نہیں بھولتے تو یہ عمل ہمارے اندر نفرت کو بڑھاتا چلا جائے گا۔ چنانچہ ہمیں اس طرح کے تلخ حقائق کو بھول جانا چاہیے۔ بلاشبہ یہ ہمارے اندر اور معاشرے کے اندر خوشگوار اثرات مرتب کرتا ہے۔ بقول سلیم آغا:

"اس کے برعکس وہ لوگ جنھیں بھول جانے کی نعمت عطا ہوئی ہو اکثر ہشاش بشاش نظر آئیں گے اور آپ کی گزشتہ بدسلوکی کے باوجود وہ آپ سے بغل گیر ہونے میں قطعاً ہچکچاہٹ محسوس نہیں کریں گے۔ ہچکچاہٹ تو اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب انھیں یاد رہا ہو کہ آپ کون ہیں اور پچھلی بار آپ نے ان سے کیا سلوک کیا تھا۔" (۱۰)

''زبان'' کے عنوان سے انشائیہ کا موضوع اخلاقیات کے زمرے میں آتا ہے۔ جس میں زبان کی قدر و منزلت کو واضح کیا گیا ہے جو کہ نیم فلسفیانہ صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ جس میں اصلاحی پہلوؤں کو براہ راست گھمبیر انداز میں پیش نہیں کیا گیا بلکہ اس میں اصلاحی پہلوؤں کو نہایت شگفتگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ انسان اپنی گفتگو سے پہچانا جاتا ہے۔ انسان کی گفتگو سے اس کے کردار کا جائزہ بھی لگایا جاتا ہے۔ مگر بعض افراد بغیر سوچے سمجھے جو زبان میں آتا ہے بولتے چلے جاتے ہیں۔ جس کے برے انجام کا اثر نہ صرف انسان کی ذات پر بلکہ دوسرے معاشرے کے افراد پر گہرا ہوتا ہے۔ انسان کی گفتگو ہی ایسی چیز ہے جس کے ذریعے وہ اپنے دشمنوں و حریفوں کو اپنا گرواید ہ بنا سکتا ہے اور اسی کے غلط استعمال سے وہ اپنے عزیزوں، دوستوں کو اپنے سے دور کر بیٹھتا ہے۔ لہٰذا ہمیشہ بولنے سے پہلے سوچنا چاہیے۔

"خوش فہمی" انشائیے کا موضوع اس کے عنوان میں پٹاری کی طرح بند ہے۔ عنوان کو پڑھتے ہی موضوع کا ادراک بھی ہو جاتا ہے۔ سلیم آغا نے زیر بحث انشائیہ میں خوش فہمی کے حوالے سے پر سیر گفتگو کی ہے۔ وہ ایک مخلص دوست کے روپ میں پند و نصائح کی باتیں کرتے ہیں کہ انسان کو ہر حال میں اچھے کی امید رکھنی چاہیے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جو آپ کو افسردہ نہیں ہونے دے گا۔ انسان میں جب خوشی کا مادہ مر جاتا ہے تو اس پر مایوسی مسلط

ہو جاتی ہے۔ مایوسی کفر ہے اور دین اسلام میں بھی مایوسی کو شرک کے مترادف قرار دیا ہے۔ بلاشبہ خوش فہمی ایک ایسا پہلو ہے جو کبھی آپ کو افسردہ نہیں ہونے دے گا اس کے مثبت نتائج ہمیشہ آپ کے حال اور مستقبل دونوں پر پڑیں گے۔ اس حوالہ سے سلیم آغا کہتے ہیں:

"میرے خیال میں خوش فہمی آج کے رنگ برنگ دکھوں اور پریشانیوں کا واحد مداوا ہے۔ اسے اپنائیے اور دکھوں سے فوراً نجات حاصل کیجیے۔ پھر نہ تو آپ کو کسی قسم کا خطرہ لاحق رہے گا، نہ آپ کو کسی کے خبث باطن کے مظاہرے سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت پڑے گی۔"(۱۱)

انشائیہ ''پسینہ'' سلیم آغا کے انشائیوں میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس کی تکنیک دوسرے انشائیوں سے قدرے مختلف ہے۔ جس کا آغاز مکالماتی انداز میں کیا گیا ہے۔ جس میں مکالمے نہایت دلچسپ، فطری اور موقع محل کے عین مطابق ہیں۔ طنز و مزاح کے عنصر کو بھی بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ انشائیے میں معاشرے کے افراد کی کاہلی کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہے کہ انسان کو چاہیے کہ وہ محنت سے کام لے کیونکہ انسانی زندگی کی تعمیر و ترقی کا راز محنت میں پوشیدہ ہے جو قوم محنت کرنے سے جی چراتی ہے ذلت و رسوائی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ اس حوالے سے انھوں نے کافی سارے دلائل کو بھی پیش کیا ہے جو ان کے نکتہ نظر کی ترجمانی کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے تاریخی واقعات کو پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس سے پہلے کہ ان کے اذہان بھی متعفن ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے بحری جہازوں کے رخ مشرق کی طرف موڑ دیئے تا کہ وہ مشرق کی خوشبو سے اپنے جسم و جان کو معطر کرنے کے علاوہ اس نعمت غیر مترقبہ کو درآمد بھی کر سکیں مگر انگریزں نے محض عطریات پر اکتفا نہیں کیا وہ واپس جاتے ہوئے اہل مشرق کے گاڑھے پسینے کی کمائی کا ایک قطرہ بہائے بغیر جہازوں میں لاد کر لے گئے اور آج وہی تاجر مشرق کو یہی عطریات، پرفیوموں، کولونوں، سپریوں کی صورت میں مہنگے داموں لوٹا رہے ہیں۔(۱۲)

''انگلیاں'' انشائیہ "کا موضوع اخلاقیات کے زمرے میں آتا ہے۔ جس میں سلیم آغا نے بڑے پر تکلف اور دوستانہ لہجے میں گفتگو کرتے ہوئے اخلاقیات کا درس دیا ہے۔

سلیم آغا کے ہاں موضوعاتی سطح پر جو بات منفرد ہے وہ یہ ہے کہ وہ معاشرے میں پائے جانے والی مفروضیات کو من و عن تسلیم نہیں کرتے بلکہ ان کو حقیقت اور منطق کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں چنانچہ بعض دفعہ ان کے انشائیوں میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ معاشرے میں عام پائے مفروضیات کی نفی کر رہے ہیں۔ جس سے پڑھنے والے سے شعور کے بالا خانے بھی کھولتے ہیں اور علمی سطح میں بھی اضافہ ہوتا ہے

سلیم آغا کا فطرت کے ساتھ خاص لگاؤ ان کے انشائیہ ''بادل'' میں نظر آتا ہے۔ انشائیہ کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے فطری مناظر کو بڑی باریکی سطح پر دیکھا ہے۔ ان مناظر نے دلی طور پر ان کو جس طرح متاثر کیا اس کا اظہار وہ اس انشائیے میں کرتے ہیں۔

جوں جوں انقلابات زمانہ میں ترقی ہو رہی ہے ویسے ویسے ہی فطری مناظر ناپید ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ جنگلات کو کاٹ کر فیکٹریاں اور سڑکیں بنائی جا رہی ہیں۔ اس صنعتی اور مشینی نظام نے انسان کو فطرت سے بہت دور کر دیا ہے۔ اس کی جگہ معنویت لے رہی ہے مگر فطرت کی اپنی دلکشی اور جاذبیت ہے جس سے دور جہاں انسان کے لیے جسمانی طور پر خطرہ ہے وہاں روحانی طور پر اس کے مضر اثرات ہیں۔ فطرت سے انسان کی روگردانی کا دکھ اس انشائیے میں پایا جاتا ہے جس کی مثال قابل ذکر ہے:

> "ہر چند کہ بجلی کو جنریٹروں کے ذریعے اور تاروں کی وساطت سے گھر گھر پہنچا دیا گیا ہے مگر اس کے جنگلی پن پر ابھی تک قابو نہیں پایا جا سکا اور یہ آئے دن کسی نہ کسی بے قصور کی جان لے کر رہی ہے جبکہ سفید بادل ایک سایہ رحمت سے جس کا مقصد ابنائے روزگار کو زیادہ سے زیادہ سکھ نہیں مہیا کرنا ہے"۔[۱۳]

"نعمت خانہ" نہایت دلکش اور جاذبیت کا حامل انشائیہ ہے۔ موضوع کے اعتبار سے اس انشائیہ میں اپنی تہذیب وثقافت کے ساتھ ایک خاص لگاؤ کو ظاہر کیا گیا ہے۔ اس لیے سلیم آغا نے انشائیہ کے عنوان ''نعمت خانہ'' کے نام سے رکھا ہے جس کو ''ڈولی'' کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ یہ ایک ایسی بند الماری ہوتی ہے جس میں عموماً دیہاتوں میں کھانے پینے کا سامان رکھا جاتا ہے۔ پاکستانی تہذیب سے جڑی اس ڈولی کے ساتھ ایک خاص اُنس ولگاؤ کو بیان کیا گیا ہے۔ انھوں نے اپنے موضوع صرف ایک تہذیبی عنصر تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس کے ساتھ پاکستان کی دیہی زندگی کی پوری تہذیب ثقافت کے ساتھ ایک خاص لگاؤ کو ظاہر کیا ہے۔ دیہاتی اور شہری زندگی کی مڈ بھیڑ کو بھی اس انشائیے میں بیان کیا ہے اور دیہاتی زندگی کو اپنے فطری وقدرتی حسن کی وجہ سے ترجیح دی گئی ہے۔

''سورج'' نامی انشائیہ میں زیادہ تر گفتگو سائنسی حوالے سے کی گئی ہے مگر اس میں سلیم آغا نے معاشرتی رویوں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ سلیم آغا کثیر المطالعہ شخصیت ہے۔ ان کا مذکورہ بالا انشائیہ سے ان کی علمی وسائنسی سطح کا پتہ دیتا ہے۔ ان کا مطالعہ صرف اردو ادب کے حوالے تک محدود نظر نہیں آتا بلکہ ان کے مطالعہ میں دیگر علوم پر بھی ان کی گرفت دیکھائی دیتی ہے۔ سلیم آغا کے ہاں منفرد بات یہ ہے کہ وہ بات سے آگے بات کو بڑھانا جانتے ہیں اور پھر بات کو اپنے موضوع کے حوالے سے استعمال کرنا ان کے فن کا خاصا ہے۔ ان کی یہ خصوصیت ان کے اس انشائیہ میں بھرپور ہے۔ وہ بات تو سورج کے حوالے سے سائنسی معلومات کو مد نظر رکھ کر کرتے ہیں مگر وہ اپنا نکتہ نظر نہیں بھولتے۔ زیر بحث انشائیے میں سلیم آغا نے معاشرے کے ان افراد کی طرف اشارہ کیا ہے جو محنت سے جی چرانے اور اپنے حسب ونسب پر فخر کرتے ہیں یعنی ہمارے آباؤاجداد بہت بڑے لوگ تھے مگر یہ حضرات خود نہیں سوچتے کہ ان میں یہ خصوصیت موجود ہے یا نہیں۔ سلیم آغا لکھتے ہیں:

> "سورج کو شمس، خورشید یا مہر قیس یا خاور اور آفتاب کے نام سے اسے پکاریں اس سے سورج کی کارکردگی میں رتی بھر فرق نہیں پڑتا چنانچہ وہ لوگ جو اپنے ناموں کے سابقوں اور لاحقوں کو ذات پات کی فصیل شدہ بکتر سے سجائے رکھتے ہیں اگر خود کسی صلاحیت کے حامل نہیں ہیں تو یہ ذرہ بکتر محض بیکار کا بوجھ بن کر انہیں ایک نہ ایک دن ضرور پیس ڈالیں گے۔"(۱۴)

سائنسی ضروریات پر حامل "مقناطیس" انشائیہ نہایت دلچسپی کا حامل ہے۔ انشائیہ کا آغاز سائنسی موضوعات سے کیا گیا ہے مگر اس انشائیہ میں کافی موڑ آتے ہیں جو کہ انشائیہ نگار کے مقصد کی ترجمانی کرتے ہیں۔ انشائیہ میں شامل گفتگو، سائنسی، سیاسی، روحانی اور اخلاقی حامل کی ہے مگر اس تمام بحث کا مقصد انسان کو اپنے آپ کو پہچاننے کا درس دیتی ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ، اپنی ذات کو پہچانے۔ وہ اپنے آپ کو اس قدر منظم کرے کہ وہ معاشرے کے افراد کے لیے ضرورت بنے۔ اس حوالے سے سلیم آغا نے زیر بحث انشائیے میں مقناطیس کو بطور استعارہ استعمال کیا ہے کہ جس طرح مقناطیس لوہے کے ٹکڑوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے یوں مسلمان اگر اپنے آپ سے آگاہ ہو جائے تو وہ غیر ملکی جن کے آگے وہ ہاتھ باندھ کر کھڑے رہتے ہیں۔ وہ ان کے زیر نگیں ہو جائے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "ہر معاشرے کے اندر ایک خاص طرح کا مقناطیس نصب ہوتا ہے جو دوسرے معاشروں کو اپنی جانب ملتفت کرتا رہتا ہے چنانچہ جس معاشرے میں یہ مقناطیس جتنا طاقتور ہو گا وہ معاشرہ دیگر معاشروں پر اسی نسبت سے غالب رہے گا"۔ [۱۵]

آمنا سامنا انشائیہ میں سلیم آغا نے بڑی پر کشش اور پر مغز بحث کو چھیڑا ہے اس انشائیہ کو اہمیت دیگر انشائیوں سے زیادہ اس وجہ سے بھی ہے کہ اس انشائیے کے عنوان اور کتاب کا نام ایک ہے۔ سلیم آغا کو موضوعات کی کمی نہیں۔ ان کے موضوعات کا دائرہ کار نہایت وسیع ہے انہوں نے رنگارنگ موضوعات کو انشائیے کا روپ دیا ہے ان موضوعات کو بیان کرتے ہوئے ان کا انداز فکر معروضی سطح کا ہوتا ہے۔ زیر بحث انشائیے کی گفتگو بڑی پیچیدہ ہے جو کہ کردار اور شخصیت کے متعلق ہے۔ سلیم آغا نے ان دونوں کے درمیان فرق کو بھی واضح کیا ہے کہ کردار کی اہمیت شخصی اور انفرادی ہوتی ہے جب کہ شخصیت کی اہمیت اجتماعی ہوتی ہے۔ سلیم آغا کے خیال میں کردار سے زیادہ شخصیت کو اہمیت حاصل ہے۔ زیر بحث انشائیے میں بھی کچھ اس طرح کے تضاد کو پیش کیا گیا ہے۔

"شخصیت تولاجونتی کے پودے کی طرح لمس کی گرمی، سردی کے مطابق ہی پھیلتی یا سمیٹی
ہے جب کہ کردار کیکر کے درخت کی طرح جامد، ٹھوس اور کانٹے دار ہوتا ہے مطلب یہ
ہے کہ شخصیت میں تغیر موجود ہے اور کردار میں ثبات پایا جاتا ہے۔ "(۱۶)

کاغذی پیر ہن سلیم آغا کا انشائیہ نہایت منفرد اور اختصار کا حامل ہے۔ سلیم آغا اپنے ارد گرد کے ماحول، مسائل اور واقعات کو ایک انشائیہ نگار کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ اشیاء کو معروضی سطح پر دیکھنے کے قائل ہیں۔ زیر بحث انشایئے میں سلیم آغا نے انسانی زندگی میں کاغذ کی اہمیت کو منوایا ہے۔ اپنے مفروضے کو درست ثابت کرنے کے لیے انھوں نے کافی دلائل کا سہارا بھی لیا ہے کہ ضرویات زندگی میں ہر جگہ ہم کو کاغذ سے ضرور استفادہ پڑتا ہے۔ پیدائش، تعلیم، بیاہ، ملازمت، انشورنس، جائیداد کی خرید وفروخت حتیٰ کہ موت تک کا مرحلہ کاغذ کا مرہون منت ہے مگر کاغذ کے وجود اور ساخت کو دیکھا جائے تو تھوڑا سا کھینچنے سے یہ نست ونبود ہو جاتا ہے۔ انسانی وجود بھی کاغذ ہی کا مماثل ہے۔ انسان کا وجود بھی اس فانی دنیا میں عارضی ہے۔ یہ دنیا کی رونقیں چند دنوں کی ہیں چنانچہ انسان کو چاہیے کہ وہ معاشرے میں صلح واتفاق سے رہے۔ عفوودرگزر سے کام لے، ان کا یہ پیغام صرف کسی ایک قوم، قبیلہ یا ملک کے لیے نہیں بلکہ ان کا یہ پیغام ملکی سرحدوں کو بھی پھیلانگتا ہوا نظر آتا ہے کہ ہمیں نہ صرف اپنے ہم ملکوں کا احترام کرنا چاہیے بلکہ غیر ممالک اور غیر مذاہب کے لوگوں کا احترام کرنا چاہیے۔ سلیم آغا لکھتے ہیں:

"درآنحالیکہ ہم اور آپ ذرا عقلمندی سے کام لیں تو نسل انسانی کے اس تانے بانے کو جس
میں بھانت بھانت کے رنگ، نسل، عقیدہ اور قومیت کے اثرات شامل ہیں آپس میں جوڑ کر
ایک طویل وعریض کاغذی پیرہن میں بدل سکتے ہیں۔ "(۱۷)

دور سائنسی اور نفسیاتی نوعیت کا حامل یہ انشائیہ نہایت منفرد اور دلچسپ تحریر کا مالک ہے۔ ان کے دوسرے انشائیوں کی طرح اس انشائیہ میں بھی فطرت کے ساتھ لگاؤ کو بیان کیا گیا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ فطرت کے ساتھ یہ قربت ان کی روح میں بسی ہوئی ہے۔ زیر بحث انشائیہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ سلیم آغا جہاں بڑھتی

ہوئی صنعتی ترقی کو انسان کے لیے خیر خواہ سمجھتے ہیں وہاں فطرت کے ساتھ قربت بھی بنی نوع انسان کے لیے کارآمد سمجھتے ہیں کیونکہ فطری حسن انسانی روح کی غذا ہے۔ بقول سلیم آغا:

"یکایک مجھے خیال آیا کہ میں نے ایک ہی پل میں تینوں زمانوں کو دیکھ لیا ہے۔ چڑیا اور درخت ماضی کی علامت ہیں، کھیتوں میں کام کرتے کسان حال کے نمائندے ہیں، جبکہ آہنی پل اور اس پر گزرتی ہوئی گاڑیاں مستقبل کے روشنی کا علامیہ ہیں۔ یہ تینوں زمانے ایک دوسرے پر کتنا تکیہ کرتے ہیں، ایک دوسرے کے کتنے محتاج ہیں۔"[۱۸]

بات سے بات نکالنے کا ہنر سلیم آغا بخوبی جانتے ہیں۔ انشائیہ گلی میں سلیم آغا نے گفتگو کو بے تکلفانہ انداز میں شروع کیا ہے۔ وہ اپنے بعض انشائیوں میں بات کو غیر معمولی انداز سے شروع کرتے ہیں۔ زیر بحث انشائیہ میں بھی انھوں نے اسی تکنیک کو اپنایا ہے۔ وہ اپنی گفتگو کی ابتدا گلی کے حوالہ سے کرتے ہیں۔ اس غیر معمولی انداز سے گفتگو کو شروع کر کے بحث کو اپنے مقصد کی طرف لے جاتے ہیں بعض مقامات پر ایسے لگتا ہے کہ وہ اپنے نکتہ نظر سے ہٹ گئے ہیں لیکن ایسا قطعاً نہیں ہوتا بلکہ وہ گفتگو کو اپنے مقصد کی ترجمانی کے لیے طول دیتے ہیں۔ جس میں پڑھنے والے کے لیے خاص پیغام ہوتا ہے۔ اس انشائیے میں ایک خاص طریقہ سے اصلاحی پہلو کو بیان کیا گیا ہے جو فنی نقطہ نظر کے بھی عین مطابق ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ جس معاشرے میں رہے وہاں ملن ساری اور اخوت وبھائی چارے کے ساتھ رہے۔ اس پیغام کے لیے انھوں نے گلی کو علامتی سطح پر استعمال کیا ہے۔ بقول سلیم آغا:

"چنانچہ گلی میں مخالف سمتوں سے آنے والے دوراہ گیر جب ایک دوسرے کے بالکل آمنے سامنے آجاتے ہیں۔۔۔ اس کے برعکس دونوں میں ایک احترام آدمیت کے جذبہ سے سرشار ہو کر دائیں بائیں طرف کو جھک جاتا ہے۔ گویا کلی کا وجود چھوٹی انا، تکبر اور احساس برتری کی بیخ کنی کرتا ہے اور جذبہ ایثار کو فروغ دیتا ہے۔"[۱۹]

''جال'' کی ابتدا مزاحیہ انداز سے ہوتی ہے جو کہ نہایت دلچسپ ہے اور قارئین کو پڑھنے پر اکساتی ہے مگر جب یہ گفتگو اپنی ابتدائی منازل طے کر کے آگے بڑھتی ہے تو نہایت فلسفیانہ روپ دھار لیتی ہے۔ سلیم آغا کا چیزوں

کو دیکھنے کا انداز معروضیت کا حامل ہے۔ وہ عام چیزوں کو بھی بڑے غور و فکر سے دیکھتے ہیں اور اس سے کوئی نہ کوئی اصلاحی پہلو ضرور نکالتے ہیں جیسا کہ مکڑی کے جالے کو دیکھ کر انسانی زندگی کے پیٹرن کے بارے میں سوچنا۔ وہ انسانی زندگی کو مکڑی کے جال سے تشبیہ دیتے ہیں۔ انسانی زندگی وسعت پذیر حقائق پر مبنی ہے۔ انسان چاہتے ہوئے بھی اس جال سے باہر نہیں پھلانگ سکتا۔ انسانی زندگی اس جال کا تانا بانا رشتوں وناطوں کی قید، مذہب اور مختلف حقائق کی مدد سے بویا گیا ہے۔ مگر پھر بھی زندگی انسان کے لیے خوشگوار محسوس ہوتی ہے۔ بقول سلیم آغا:

> "دراصل پورا سماج ایک ایسا جال ہے جس میں فرد کو پھانس لیا گیا ہے۔ بے شک فرد ابتداً سماج کو جنم دیتا ہے اور پھر طرح طرح کے قوانین اور رسوم وروایات کا مضبوط اور کھردرا جال پھیلا دیتا ہے لیکن پھر جب یہ جال مختلف عوامل کی بنا پر تنگ ہونا شروع ہوتا ہے تو فرد کی اپنی سانس بھی رکنے لگتی ہے۔"(۲۰)

اختصار کا حامل یہ انشائیہ "بلبلہ' نہایت دلچسپ ہے جس میں مصنف نے اپنی زندگی کے بچپن کے واقعات کو بیان کیا ہے اور ساتھ بچپن کی عمر کی کچھ نفسیات کا ذکر بھی کیا ہے۔ مصنف نے اس انشائیہ میں فلسفہ زندگی کی جھلک دکھائی ہے۔ جو اس سے پہلے "جال" میں پیش ہونے والی گفتگو کو تقویت دیتی ہے۔ زیر بحث انشائیے میں بلبلے کو انسانی زندگی کے مماثل قرار دیتا ہے۔ بلبلہ دیکھنے میں یوں انسانی زندگی جو کہ بظاہر کافی خوش رنگ اور پر کشش ہے لیکن یہ جلد ہی ختم ہونے والی شے ہے۔ اس کے گزرنے میں کوئی پتہ نہیں چلتا۔ انسان کو چاہیے کہ وہ زندگی کی رنگینوں کو اپنے اوپر مسلط کر کے اپنے حقیقی مقصد کو نہ بھولے۔ دنیا کی وہ اشیاء جو اس کو پائیدار اور ابدی معلوم ہوتی ہیں یہ سب عارضی اور ختم ہو جانے والی ہیں۔ بقول سلیم آغا:

> "لیکن دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ بلبلہ اپنی رنگین اور منور کائنات کے باوجود سوئی کی نوک کی ذرا سی چبھن بھی برداشت نہیں کر سکتا اور فوراً پاش پاش ہو جاتا ہے۔ کیا انسانی زندگی بھی بلبلے ہی کے مانند نہیں۔"(۲۱)

جدید اور قدیم تہذیب کی تکرار اس انشائیہ میں ملتی ہے۔ انشائیہ کا عنوان ''پُل'' قدیم تہذیب سے تعلق رکھتا ہے۔ زیر بحث انشائیہ میں سلیم آغا نے جدید تہذیب کی بدولت قدیم تہذیب کو انسانی روح کے لیے دلکش قرار دیا ہے۔ قدیم تہذیب بنی نوع انسان کو بہت حساس بناتی ہے۔ لوگ فطرت کے قریب رہتے تھے مگر جدید تہذیب نے انسانوں کے احساسات کو ختم کر دیا ہے۔ بقول اقبال:

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

بات کو عمومی انداز میں شروع کر کے فلسفیانہ سطح پر لے جانا سلیم آغا کے انشائیوں کا خاصا ہے۔ مذکورہ بالا انشائیہ "موم بتی" میں بھی انھوں نے گفتگو کو اسی انداز سے شروع کیا ہے جو کہ موم بتی سے شروع ہو کر اخلاقیات کے زمرے تک چلی جاتی ہے جو کہ ان کے خاص مقصد کی ترجمانی کرتی ہے۔ جس سے جہاں وہ اپنا پیغام قارئین تک پہنچانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ وہاں ان کی تحریر فن کی بلندیوں سے بھی نیچے نہیں گرتی۔ زیر بحث انشائیہ میں موم بتی کو استعارہ بنا کر اصلاحی مقصد کی ترجمانی کی گئی ہے۔ انسانی معاشرہ افراد ہی سے تشکیل پاتا ہے۔ افراد کے گروہ ہی معاشرے کو جنم دیتے ہیں۔ افراد کے بغیر معاشرے کا وجود عمل میں نہیں لایا جا سکتا۔ ایک خوشگوار معاشرے کے لیے ضروری ہے کہ وہاں کے لوگ آپس میں مل جل کر رہیں۔ ایک دوسرے کا دکھ سکھ بانٹیں، دوسروں کی تکلیف کو اپنا ذاتی دکھ سمجھیں۔ اپنے مفادات کی خاطر دوسروں کے احساسات وخواہشات کو بھینٹ نہ چڑھادیں۔ ہمیشہ ایک ایسی موم بتی کی طرح جو خود جل کر بھی دوسروں کو روشنی پہنچاتی ہے۔ بقول سلیم آغا:

> "جوں جوں موم پگھلتی گئی توں توں میرے دل میں یہ احساس پختہ ہوتا چلا گیا کہ موم بتی تو ایثار اور قربانی کا عظیم شاہکار ہے کیونکہ یہ اپنے آپ کو ختم کر کے دوسروں کے آنگن میں اجالا کرتی ہے۔"[۲۲]

انشائیہ "دھاکہ" کا آغاز مزاحیہ انداز میں ہوتا ہے لیکن گفتگو آگے چل کر بالکل ہی نیا موڑ لے لیتی ہے۔ جس سے گفتگو میں چاشنی پیدا ہوتی ہے جو کہ پڑھنے والے کو ابتدا ہی سے اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ سلیم آغا کا زیر

بحث انشائیہ میں جدوجہد کا پیغام ملتا ہے کہ انسان کو چاہیے کہ وہ محنت وجدوجہد کو اپنا شعار بنائے۔ اپنے آپ میں زندگی کی تڑپ پیدا کرے۔ ایسی تڑپ جو اس کی زندگی کے سمندر کی موجوں میں اضطراب پیدا کرے۔ انسانی زندگی کی جان یہی اضطراب ہے کہ انسانی زندگی کو دلکش بنائے ہوئے ہیں۔ انسان کا بربریت سے مہذب معاشرہ میں قدم رکھنا ایسی اضطراب اور تڑپ سے ہی ممکن ہوتا ہے۔ زندگی میں یہی اضطراب انسانی زندگی کی رنگینی کا سبب ہے۔بقول سلیم آغا:

"دھماکے کے فوائد ان گنت ہیں، یہ پرانی دنیا کے خاتمے اور نئی دنیا کی آمد کا اعلان ہے۔
اس سے خون میں گرمی، ہوا میں خروش اور روشنی میں تمازت پیدا ہوتی ہے۔"(۲۳)

انشائیہ ''آمنا سامنا'' میں مغربی مفکر ہربرٹ ریڈ کی اس بات سے سیلم آغا قزلباش نے روشنی حاصل کی ہے کہ کردار انسانی زندگی کا وہ واقعہ ہے جو اس شخصیت پر عمر بھر حاوی رہتا ہے۔ سنجیدگی کا حامل اور فلسفیانہ لب و لہجے کا یہ انشائیہ سیلم آغا کی ذہنی بلوغت کی عمدہ مثال ہے۔ توضیحی کم اور تشریح زیادہ ہے کہ موضوع کسی کسی زاویے سے گرفت میں آنا مشکل تھا۔ بلاشبہ آمنا سامنا موضوعات کی رنگا رنگی مواد میں قابل قدر تنوع اسلوب میں فلسفیانہ، تفکرانہ، شگفتہ اور سنجیدہ انداز تحریر نے اب تک اسے سلیم آغا کا سب سے عمدہ مجموعہ کہلانے کا حقدار بنا دیا ہے۔

ج) نام میں کیا رکھا ہے کے تناظر میں:۔

نام میں کیا رکھا ہے ڈاکٹر سیلم آغا قزلباش کے انشائیوں کا تیسرا مجموعہ ہے جو جنوری ۲۰۰۵ء میں کاغذی پیرہن لاہور کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ اس کا فلیپ پروفیسر جمیل آذر اور شاہد شیدائی نے جبکہ بیک فلیپ رشید امجد کا مرقومہ ہے۔ اس مجموعے کا پیش لفظ منور عثمانی نے تحریر کیا اور اسے رشید امجد کے نام انتساب کیا گیا۔

نام میں کیا رکھا ہے سلیم آغا کے انشائیوں کی تعداد بارہ ہے۔ جس کے عنوان ''جملہ معترضہ''، ''ایک دو تین'' ''چوہے'' ''آنسو بہانا'' قصہ گردن کا غسل اور غسل خانے ''نام میں کیا رکھا ہے'' ''خوف کھانا'' شرافت ''''مکان'' ''لباس'' 'کھال کے صدر رنگ ہیں۔

سلیم آغا قزلباش کے انشائی سفر کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ واضح ہے کہ انہوں نے بیسویں صدی کے آٹھویں عشرے میں انشائیہ نگاری کی طرف توجہ کی یہ زمانہ اردو انشائیہ کے عروج کا ہے اور صحیح معنوں میں اردو انشائیہ کا عہد زریں کہلانے کا سزاوار ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر، مشتاق قمر اور ڈاکٹر انور سدید کے بعد اردو انشائیہ نگاری میں نہ صرف سلیم آغا کا نام مستند ہے۔ بلکہ وہ انشائیہ نگاری میں نوجوان نسل کا استعارہ اعلامیہ بن کر وار د ہوئے یہی وجہ ہے کہ شاید شیدائی انہیں دوسرے ہر اول دستے میں شامل کرتے ہیں۔

سلیم آغا کے انشائیوں کا قدرے نمایاں پہلو موضوعات کا انتخاب ہے۔ ان کے انشائیوں کے موضوعات کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلی قسم غیر مرئی موضوعات کی ہے۔ جن میں عادات اور خصائل پر خامہ فرسائی کی ہے؛اس نوعیت کے انشائیوں میں " شرافت""خوف کھانا""آنسو بہانا" اور نام میں کیا رکھا ہے"ہیں۔ دوسری قسم کے موضوعات معمولات کی زندگی سے متعلق ہیں۔ جن میں "کان""لباس""غسل" اور غسل جانے ہیں۔ تیسری قسم داستانوی انداز کے حامل موضوعات کی ہے۔ جن میں "کھال رنگ "،" صد رنگ"، "ایک دو تین" ،"قصہ گردن کا" اور "چوہے "ہیں۔

رونا دھونا اور آنسو بہانا عموماً انسان کی کمزوری خیال کی جاتی ہے اور رونے والا آنسو کے ذریعے مصیبت کے ازالہ کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن انشائیہ نگار نے اپنی روایتی تصور کے برعکس رونے کو زندگی کا اعلامیہ قرار دینے کے ساتھ ساتھ اسے ایک نعمت بھی خیال کیا ہے اور رونے کے عمل کو انسان اور حیوان کے مابین حد فاصل قرار دیتے ہوئے یوں لکھا ہے:

> "اس نعمت سے صرف حضرت انسان کو نوازا گیا اور انسان کی حالت یہ ہے کہ ذرا دل کو ٹھیس پہنچی آنسو پلک سے ٹوٹ کر گر پڑا۔ اس کے برعکس پرندے اور جانور صرف آواز کے زیر و بم سے غم یا خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ جب کہ انسان کبھی ہنس کر دوسروں کو رلاتا ہے۔ اور کبھی رو کر دوسرں کو ہنساتا ہے۔ (۲۴)

انشائیہ "چوہے" کی مثال ملاحظہ ہو جس میں چوہے کی کسمپرسی اور اس کے تجربہ گاہوں کی بھینٹ چڑھنے کے المیہ کے باوصف عوام انہیں مطعون قرار دیتے ہیں۔ عوام کے خیال میں چوہے طاعون پھیلاتے کا باعث ہیں مزید بر آں وہ چوہوں کی مکاریوں اور چالاکیوں کا ذکر کرتے ہیں کہ یہ ڈبل روٹی یا باسی روٹی کے ٹکروں سے جھانسے میں نہیں بل کہ بڑے چالاک ہیں اور عورتوں کے ڈرانے میں تو بڑے مشتاق ہیں۔ بقول ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش:

> "چوہا عموماً ہر طبقے کی خواتین کے ہوش حواس پر اس حد تک مسلط ہوتا ہے کہ کسی کونے کھدرے میں ذرا سی کھسر پھسر ہو تو ان کے اوسان خطا ہونے لگتے ہیں حتیٰ کہ مطلق العنان خاتون خانہ بھی چوہے کے سامنے بھیگی بلی بن جاتی ہے۔ البتہ چھپکلیاں اگر یہ سمجھتی ہوں کہ وہ اس کام میں چوہوں سے زیادہ شہرت رکھتی ہیں تو جھگڑا نمٹانے کے لیے ریفرنڈم کرایا جا سکتا ہے لیکن اس حقیقت کو آپ تسلیم کریں گے کہ خواتین کے اجتماع میں بھگدڑ مچانے کے لیے ایک چوہا ہی کافی ہے۔"[۲۵]

سلیم آغا قزلباش کی انشائیہ نگاری کا ایک وصف یہ ہے کہ وہ اپنے انشائیہ کی ابتدا ایک مفروضہ نما جملہ سے کرتے اور پھر اس کی تائید و تردید میں مختلف دلائل دیتے ہیں۔ اس طرح انشائیہ کے اولین جملہ ہی سے قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ جس سے قاری ایک طرف تو متجسس ہوتا ہے اور ساتھ ساتھ دلچسپی بھی لینے لگتا ہے تو ایسی رائے عامر عبداللہ کے یہاں بھی ملتی ہے۔

مذکورہ بالا انشائیہ میں انشائیہ نگار نے غسل کو راگ کی ایجاد کا باعث قرار دیا ہے کہ جب خدام ادب ٹھنڈے پانی سے نہاتے غسل خانے میں داخل ہوتا ہیں اور جیسے ہی ٹھنڈا پانی ان کے جسم پر پڑتا ہے تو ان کی منہ سے بے ساختہ صداتیں بر آمد ہوتیں ہیں جو یخ بستہ پانی کا دین تھیں یہی چیخ و پکار آخر کار کسی نہ کسی راگ کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں اسی طرح مختلف راگ وجود میں آئے۔

ایک اور انشائیہ "نام میں کیا رکھا" ہے۔ میں پہلے عوام کی رائے پیش کرتے ہیں جو کام کو نام پر ترجیح دینے سے عبارت ہے۔ بعد ازاں اس کی تردید میں مختلف دلائل پیش کرتے ہیں۔ جس سے انشائیہ میں دل چسپی کا عنصر در آتا ہے مثال کے طور پر:۔

> "کہا جاتا ہے کہ اصلی چیز آدمی کا کام ہے۔لہذا نام سے زیادہ کام پر اور صورت سے زیادہ سیرت پر نظر رکھنی چاہیے مگر مجھے اس زاویہ نظر سے مکمل اتفاق نہیں آپ پوچھیں گے اس میں اتفاق نہ ہونے والی کون سی بات ہے تو میں عرض کروں گا کہ سارا کھیل تماشا نام سے شروع ہو کر نام پر ختم ہوتا ہے۔"(۲۶)

نام کے بغیر انسان کی مثال بغیر نمبر پلیٹ والی گاڑی کی سی ہے اور جو سلوک اس گاڑی کے ساتھ ہوتا ہے۔ جس کی نمبر پلیٹ نہ ہو وہی سلوک بے نام شخص کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔وہ اگر اتفاق سے پولیس کے ہتھے چڑھ جائے تو مفت میں حوالات کی ہوا کھانا پڑتی ہے اور انسان کی ذلت وعزت کا انحصار نام پر ہے۔مزید بر آں کسی کو خراج تحسین پیش کرتے یا گالیاں دینے کا عمل بھی نام ہی کا مرہون منت ہے۔اس لیے نام کی اہمیت اساسی ہے۔ تاہم وہ پورے انشائیے میں پہلے جملے کی تائید وتردید میں دلائل پیش کرتے ہیں اور موضوع کے مختلف پہلوؤں کو منکشف کرتے ہیں۔ایک اور انشائیہ شرافت میں شرافت اور بدمعاشی کا موازنہ کرتے ہیں۔ جس سے قاری اختلاف واشتراک میں لطف محسوس کرنے لگتا ہے:۔

سلیم آغا نہ صرف انشائیہ کی ابتدا میں ممتاز ہو جاتے ہیں۔ دیگر انشائیہ نگاروں کے برعکس اپنے انشائیہ میں اختصار سے کام نہیں لیتے بلکہ موضوع کے جملہ پہلوؤں کے انکشاف کی ممکنہ کوشش کرتے ہیں اور مخفی نکات کو سامنے لاتے ہیں۔ جن سے ان کا انشائیہ طویل ہو جاتا ہے۔جبکہ ان کے برعکس دیگر انشائیہ نگار اختصار سے کام لیتے ہیں۔

کسی بھی موضوع کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لانے کا عمل وسیع مطالعہ کا ہونا ضروری ہے اور سلیم آغا کا اپنے موضوع کی ممکنہ جہات کو قاری کے سامنے پیش کرتے ان کے وسیع مطالعہ کا ثبوت ہے۔ سلیم آغا انشائیہ نگاری میں خود کو مشرق و مغرب کے خانوں میں منقسم نہیں کرتے بلکہ عالمی اور آفاقی انسان کی نظر سے موضوع کا جائزہ لیتے ہیں اور مشرق و مغرب کی تہذیب وادب بھی انشائیہ میں اجاگر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مشرقی تہذیب کی عکاسی کے ساتھ ساتھ مشرقی تہذیب کی خوبیوں اور کمزوریوں کو بھی پیش کرتے ہیں۔ مثلاً وہ انشائیہ غسل اور غسل خانے میں مغربی ممالک کے غسل خانوں کو مزین اور مرصع کاری سے رجحان اور غسل خانے پر پورے گھر سے زیادہ خرچ کرنے کی روایت کو طنزاً مغرب کی ترقی کا راز قرار دیتے ہیں۔

"کون نہیں جانتا کہ مغرب والے جب تک غسل سے بدکتے رہے ان کی ترقی کی رفتار بھی سست رہی لیکن جیسے ہی انھوں نے غسل خانوں کی رونق بخشا شروع کر دی۔ بدن کے ساتھ ساتھ ان کے اذہان کی پوست بھی ڈھل گئی اور میل کچیل کی تہوں سے آزاد ہو کر ایسے چمکے کہ آج نہ صرف ہر طرف انہی کا صابن شیمپو اور تیل چل رہا ہے بلکہ پوری دنیا ان کے نقوش پر چلنے کی آرزومند دکھاتی دیتی ہے"۔ (۲۷)

سلیم آغا طنز نگار یا مزاح نگار کی طرح تہذیب مغرب کی خامیاں اور کمزوریاں ہی بیان نہیں کرتے بلکہ تہذیب مغرب کی خوبیوں اور عالمی ادب کی مثالوں کو بھی پیش کرتے ہیں یعنی وہ ایک متعصب شخص کی طرح صرف تصویر کا منفی تاریک پہلووں نہیں دیکھتے بلکہ روشن پہلووں کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔

مغربی دنیا بیسویں صدی میں داخل ہوتے ہی اپنے بدن کے نشیب وفراز پر اسطرح پردے اٹھائے کہ اب خالص پردہ نام کی کوئی چیز باقی نہیں۔ مشرق والوں نے ان کی تقلید میں دیر نہیں کی جوں جوں مشرق والے لباس کی پکڑ سے باہر ہوتے جارہے ہیں توں توں وہ سکہ بند اخلاقیات کے صدیوں پرانے لبادے خود سے نوچ نوچ کر پرے پھینک رہے ہیں۔ یوں مشرق والے بھاری بھر کم لباس سے نجات پاتے جارہے ہیں۔ سلیم آغا کے انشائیوں میں انگریزی زبان کے الفاظ اور اصطلاحات باکثرت پائی جاتی ہے۔ اور وہ ان الفاظ کو بہتر ابلاغ کے وسیلہ کے طور پر

استعمال کرتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ وہ نامانوس اور نئے انگریزی الفاظ برتتے ہیں بلکہ وہ الفاظ جو معمول کی گفتگو میں مستعمل ہیں ان کا موقع و محل کے مطابق استعمال کرتے ہیں:

انشائیہ چوں کہ بھاری بھر کم جملوں اور بوجھل تراکیب کا متحمل نہیں ہوتا اس لیے سلیس اور سادہ زبان کا استعمال ہی مناسب ہوتا ہے۔ سلیم آغا قزلباش بھی انشائیے کی زبان سادہ رواں استعمال کرتے ہیں مثال کے طور پر انشائیہ آنسو بہانا'' کا اقتباس ملاحظہ ہو:

"بھلا ہو ان بیوٹی پارلروں کا جن کے عالم ظہور میں آنے کے بعد کم از کم دلہنوں نے تو رخصتی کے وقت آنسو بہانے کا پروگرام منسوخ کر دیا ہے اور شومی قسمت سے اگر کوئی دلہن مشرقی روایات کی پاس داری میں رونے دھونے پر کمر بستہ ہو جائے تو اس نازک وقت میں اس کی کوئی نہ کوئی ہم راز سہیلی کمر میں کہنی مار کر اس کے کانوں کچھ کھسر پھسر کرتی ہے جس پر دلہن کی آنکھوں میں اُمڈے آنسو فی الفور محض غم کے تاثرات سے ہی کام چلا لیتے ہیں۔"(۲۸)

سلیم آغا کے انشائیوں کے اسلوب سے متعلق رشید امجد یوں رائے دیتے ہیں:

"سلیم آغا کا اسلوب سادہ مگر پُر تاثیر ہے بظاہر سادہ لفظوں سے انھوں نے معنوی اسرار بیان کیے ہیں۔ جملوں کی بندش لفظوں کی نشست و برخاست پر انھیں قدرت حاصل ہے۔ یہ ان کے اسلوب کا کمال ہے کہ وہ معنویت کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر جو موتی تلاش کرتے ہیں۔ انھیں اتنی عمدگی اور سلیقے سے قاری تک پہنچا دیتے ہیں کہ وہ نہ صرف ان کی چمک دمک محسوس کر لیتا ہے بلکہ ان کی معنویت تک بھی پہنچ جاتا ہے"۔(۲۹)

سلیم آغا نے انشائیوں کی خوبی نہ صرف شگفتہ اور رواں اسلوبِ تحریر ہے بلکہ وہ سلیس اور آسان زبان کے ساتھ ساتھ سوچ اور فکر کا پہلو بھی پس پشت ڈال دینے کے قائل نہیں۔ ان کے انشائیے جہاں بہ لحاظ اسلوب کامیاب ہیں وہاں نکتہ آفرینی کا بھی طریق احسن دھیان رکھتے ہیں۔

انشائیہ شرافت کو غیر فطری امر قرار دینے کے بعد اس کی تائید وتردید میں دلائل دیتے ہوئے آخر میں انشائیہ کا اختتامایسے پیراگراف کی صورت میں کرتے ہیں جہاں شریف آدمی کے لیے قاری کے دل میں ہم دردی کا جذبہ جنم لیتاہے۔

> "تاہم شریف آدمی کو جیتے جی تو کوئی نہیں چھوڑ تا بالفرض محال دنیاوالے اسے چھوڑ بھی دیں تو کم از کم گھر والے اسے کسی قیمت پر نہیں چھوڑتے البتہ اس کے وفات پاجانے کی صورت میں ہر تعزیت کرنے والے کی آمد پر مرحوم کے لواحقین گلوگیر آواز میں یہ بات دہراتے نہیں تھکتے مرحوم مغفور مرتے دم تک سارے کام اپنے ہاتھوں سے کرتے تھے، کھانا صرف ایک وقت کا کھاتے تھے، دوسرے وقت کا کسی نے پوچھ لیا تو انکار نہیں کرتے تھے۔ غسل ہمیشہ کمیٹی کی نل کے نیچے بیٹھ کر کرتے تھے ساری زندگی میلے کپڑوں میں گزاری مگر شرافت کا دامن کبھی میلانہ ہونے دیا۔"[۳۰]

ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کے انشائیوں میں عصری آگہی اور عصری شعور دونوں بہ درجہ اتم موجود ہیں۔ معاشرے کی اصطلاح بھی کرتے ہیں اور عصر حاضر کے حالات وواقعات پر بھی انوکھے انداز میں بات کرتے ہیں۔ یوں کہ بات بھی قاری تک پہنچ جائے اور اختلافات کا عنصر بھی نہ ابھرے۔ وہ گہرے خیالات کا شگفتہ اور لطیف الفاظ کا جامہ پہنا کر انشائیے کی شکل میں قارئین کے حضور پیش کرتے ہیں تو ان کے دلوں کو فرحت، ذہنوں کو بالیدگی اور نگاہوں کو کشادگی عطا کرتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ جمیل آذر، پروفیسر، "انشائیہ اور انفرادی سوچ" نقش گر پبلی کیشنز راولپنڈی، ۲۰۰۴، ص ۲۳

۲۔ سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، "سر گوشیاں"، حرف اول از مشتاق قمر، اردو زبان، سرگودھا، ۱۹۸۰ ص ۶۷

۳۔ سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، "سر گوشیاں"، بیک فلیپ از ڈاکٹر وحید قریشی مکتبہ فکر و خیال، لاہور، جون ۱۹۸۰

۴۔ سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، "سر گوشیاں"، اردو زبان"، سرگودھا، جون ۱۹۸۰، ص ۱۱

۵۔ ایضاً، ص ۱۳

۶۔ ایضاً، ص ۲۳

۷۔ ایضاً، ص ۲۶

۸۔ سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، "آمنا سامنا"، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، جون ۱۹۸۷، ص ۳۶

۹۔ ایضاً، ص ۴۰

۱۰۔ ایضاً، ص ۴۷

۱۱۔ ایضاً، ص ۴۹

۱۲۔ ایضاً، ص ۵۳

۱۳۔ ایضاً، ص ۵۶

۱۴۔ ایضاً، ص ۶۱

۱۵۔ ایضاً، ص ۶۵

۱۶۔ ایضاً، ص ۷۲

۱۷۔ ایضاً، ص۷۷

۱۸۔ ایضاً، ص۸۲

۱۹۔ ایضاً، ص۸۹

۲۰۔ ایضاً، ص۹۶۔۹۷

۲۱۔ ایضاً، ص۱۰۴

۲۲۔ ایضاً، ص۱۰۴

۲۳۔ ایضاً، ص۱۰۷

۲۴۔ ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، "نام میں کیار کھا ہے "کاغذی پیر ہن، لاہور، ۲۰۰۵، ص۱۱۴

۲۵۔ ایضاً، ص۱۲۹

۲۶۔ ایضاً، ص۱۳۴

۲۷۔ سلیم آغا قزلباش ''نام میں کیار کھا ہے'' کاغذی پیر ہن، لاہوی، جنوری ۲۰۰۵

۲۸۔ سلیم آغا قزلباش، نام میں کیار کھا ہے، ص۲۱۔۲۰

۲۹۔ ایضاً، ص۲۲،۲۱

۳۰۔ ایضاً، ص۳۷

باب چہارم:

معاصر انشائیہ نگار اور ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کی انفرادیت

الف) معاصر انشائیہ نگار:۔

اردو انشائیہ کے میدان میں ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کی آمد گو یا نئی نسل کی شمولیت کا اعلامیہ ثابت ہوئی۔ اُردو کے منجھے ہوئے ادباء کے برعکس نسل نے اس کا شعور باخوبی حاصل کیا اور اسے کماحقہ اپنا کر اپنے ہونے کا ثبوت دیا۔

بیسوی صدی کے اختتام اور اکیسویں صدی کے اوائل میں مجلہ ''اوراق'' کی اشاعت کی معطلی اور بعد ازاں ڈاکٹر وزیر آغا کی وفات سے انشائیہ نگاری کی رفتار خاصی متاثر ہوئی تاہم اکیسویں صدی عیسوی صدی میں صنف انشائیہ کو فروغ دینے والوں میں ڈاکٹر وزیر آغا، پروفیسر جمیل آذر، اکبر حمیدی، حامد برگی، ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر ناصر عباس نیر، مشتاق احمد، عبدالقیوم، منور عثمانی، ڈاکٹر محبوب عالم، انجم نیازی، عامر عبداللہ، شفیع ہمدم، حنیف باوا اور شاہد شیدائی نمایاں ہیں۔ ان معاصرین انشائیہ نگاروں میں سے چند ایک کا ذکر اس باب میں کیا جائے گا۔

منور عثمانی:۔

منور عثمانی کا پہلا انشائیہ ''فرنٹ سیٹ'' (ماہنامہ اوراق، لاہور) میں ۱۹۹۵ میں جب کہ اس کے مجموعے کا آخری انشائیہ '' نامہ اعمال کی دل آویزی'' (ماہنامہ کاغذی پیرہن، لاہور) ۲۰۱۰ میں شائع ہوا۔ فرنٹ سیٹ بنیادی طور پر ۹ انشائیوں کا مجموعہ ہے۔ جن کے عنوان ''فرنٹ سیٹ'' قائل کرنا'' ریڈیو کے حق میں آخری آواز'' ''پیدل چلنا'' ''طنز'' '' ممتحن کی ڈائری'' '' صبح کا تارا'' نئے گھر کی خوش گوار بات'' لمحہ موجود کا پھیلاؤ'' ''متفرق پرچوں پر لکھا میں'' باتیں کیا کرو۔ دھند میں سفر شروع ہوا'' اور نامہ اعمال کی دل آوایزی'' ہیں۔

منور عثمانی کے مجموعے فرنٹ سیٹ کے متعلق ڈاکٹر وزیر آغا یوں لکھتے ہیں:

"فرنٹ سیٹ منور عثمانی کے خوب صورت اور خیال انگیز انشائیوں کا پہلا مجموعہ ہے مگر اسلوب کی تخلیقی رعنائی اور فکر کی گہرائی اس بات کی گواہ ہے کہ مصنف کہ یہ مجموعہ ان کے اعماق میں آہستہ آہستہ صورت پذیر ہوا اور اعمال آہستگی سے منظر عام پر آتا رہا لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ منور عثمانی کے انشائیوں کے تیور دیکھتے ہوئے اسے اور اردو انشائیہ کے بنیاد گزاروں میں شامل کرسکتے ہیں۔"[1]

ڈاکٹر وزیر آغا منور عثمانی کو ان کی انشائیہ نگاری کے بدولت انشائیہ کے بنیاد گزاروں میں شامل کرتے ہیں چند یہ ایک فوقیتی بیان ہی سہی تاہم اس بات سے ہرگز ممکن نہیں کہ اکیسویں صدی میں انشائیہ کو فروغ دینے میں منور عثمانی کا نام نمایاں ہے۔

"منور عثمانی کے انشائی مجموعہ "فرنٹ سیٹ" سے متعلق رائے دیتے ہوئے ڈاکٹر امجد پرویز یوں بیان کرتے ہیں:

Overall the book is treat and read especilay in the backdrop of the literature that came into being and propably longer in vonge depciitng the culture of the sub continent at the time when Aligarh university was at its top. It has a beautifulanalysis given by Munwar Usmani as to hour inshaiya is differentiated from Humour. Also included is some interestingselection of Rasheed Ahmad Siddiqui"s work for the present generation interested in Urdu literature.[2]

مزید بر آں شاید شیدائی ان کو خراج تحسین ان لفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

منور عثمانی کا امتیاز ہے کہ انہوں نے انشائیہ نگاروں کے لیے ان موضوعات کو مختص کیا جو عموماً عوام کی نظروں سے پوشیدہ ہیں۔ یوں وہ روایت کی اندھی تقلید کے قائل نہیں ہیں۔ بلکہ ان موضوعات پر خاصہ فرسائی کرتے ہیں۔ جنہیں سماج میں عموماً حاشیے پہ جگہ دی جاتی ہے اور ان پر خاصہ فرسائی کرنا کم ادیبوں کو نصیب ہوتا ہے۔

انشائیہ ریڈیو کے حق میں آخری آواز میں ریڈیو کو اس زمانے میں کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ فی زمانہ کیبل، ٹی وی اور انٹرنیٹ نے ریڈیو کی اہمیت کو کم ہی نہیں بلکہ ختم کر دیا ہے۔ موجودہ دور میں کوئی ریڈیو پر توجہ صرف نہیں کرتا لیکن منور عثمانی نے ایک حساس انسان کی طرح اس کمی کو محسوس کیا اور ریڈیو سے متعلق مختلف پہلوؤں کو سامنے لا کر اس کے حق میں دلائل دینے کی کوشش کی ہے۔ ایک زمانے کی بات ہے کہ لوگ بیٹھتے تھے اور داستان گوئی کے علاوہ ریڈیو پر خبریں سنا کرتے تھے اور ایک دوسرے کے چہرے دیکھتے تھے۔ لیکن فی زمانہ ٹیلی ویژن نے اس کی اہمیت کو کم دیا ہے۔ حالانکہ ریڈیو ایک ایسا ذریعہ تھا۔ جس میں ہم مراسلہ اور ملاقات کے بغیر ایک دوسرے سے ملاقات کا شرف اٹھا سکتے ہیں۔

ایسی طرح ''پیدل چلنا'' بھی ایک ایسا عمل ہے، جو موجود زمانے میں قریب قریب معیوب تصور کیا جاتا ہے۔ اور مراعات کی دستیابی کے باعث چلنے کا عمل ناقابل تحسین خیال کیا جاتا ہے۔ حالاں کہ صحت کے لیے چلنا ضروری نہیں بلکہ اساسی حیثیت کا حامل ہے۔ منور عثمانی کا یہ کمال ہے کہ وہ نہ صرف پیدل چلنے کا مشورہ دیتے ہیں بلکہ ایک تخلیق کار کے لیے اس عمل کو ناگزیر قرار دیتے ہیں۔

> "پیدل چلنے والے کی صحت اور سیرت قابل اعتماد ہوتی ہے۔ قابل رشک ہو یا نہ ہو یا اس کے نزدیک متحرک ہونا ہی معتبر ہونے کی اصل شرط ہے۔ باقی شرطیں پوری ہوں یا نہ ہوں، اس کا مسئلہ متحرک ہی نہیں، تہذیب و شائستگی بھی ہے۔ اس کا مقصد سفر ہی نہیں،

رہ رسم بھی ہے۔ ملاقات ومواخات کے سہارے صرف اور صرف اس کے دم قدم ہیں۔
خیر مقدمی تپاک اس کا مزاج بھی اور مسلک بھی۔"[۳]

منور عثمانی سے انشائیوں کی خوبی صرف یہ نہیں کہ وہ موضوعات میں تنوع اور نسبتاً غیر معروف پہلوؤں خامہ فرسائی کرتے ہیں۔ ان کے انشائیوں کی زبان بھی سنبھلی ہوتی ہے۔ ہر چند انھوں نے غیر مانوس موضوعات پر قلم اٹھایا۔ وہ تراکیب اور استعاروں کا استعمال نہیں کرتے بلکہ رواں اور سلیس عبارت میں اپنے مدعا کا اظہار کرتے ہیں۔

اس طرح ایک اور انشائیہ ''صبح کا تارا'' میں وہ صبح کے تارے کو جہاں ڈھلتی شب کا سلام آخر گردانتے ہیں۔ وہاں ہونے والی صبح کا استعارہ بھی قرار دیتے ہیں۔ صبح کا تارہ آنے والے دن کے سورج کا اعلامیہ ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا مجموعے کا پہلا انشائیہ فرنٹ سیٹ'' اس انشائیہ میں انشائیہ نگار فرنٹ سیٹ کو گاڑی میں موزوں اور ہر جگہ اسی سیٹ پر بیٹھ کر ہی مسافر مناظر فطرت کا یہ طریق احسن مشاہدہ کر سکتا ہے۔ لیکن اس سیٹ پر سونا ممنوع ہے۔ کیوں کہ فرنٹ سیٹ پر سوجانا ڈرائیور کو بھی کاہلی اور سستی پر اکسا سکتا ہے اور کسی حادثے کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا ہے۔

فرنٹ سیٹ پر سو جانا ایک مادی نقصان کا سبب بنے یا نہ بنے ایک جمالیاتی زیاں کا باعث ضرور بنتا کہ اس پر اونگھنے والا اس مشائدہ جمال سے محروم ہو جاتا ہے جو اس کا حق بھی ہے اور فرض بھی۔

فرنٹ سیٹ پر براجمان شخص کے مناظر فطرت کے کامیاب اور بہتر مشاہدے کے لیے اس کی نظر کا ٹھیک ہونا اور ڈرائیور کا خاموش طبع ہونا اس لیے ضروری ہے کیوں کہ درج بالا باتوں کے بعد ایک مسافر بہترین مشاہدہ کار ثابت ہو سکتا ہے۔ اور وہ لوگ جو فرنٹ سیٹ کے بجائے عقبی نشستوں پر بیٹھے ہوتے ہیں۔ وہ منظر کی لطافتوں کو نہیں سمیٹ سکتے۔ ان کا مشاہدہ ادھورا اور ایک طرفہ ہوتا ہے۔

انشائیہ ممتحن کی ڈائری میں امتحان کی خرابیوں اور طلبہ کی نا اہلی کو انشائیہ بناتے ہیں کہ بیش تر طالب علم پڑھنے لکھنے سے گھبراتے ہیں گویا وہ اس کام کو وقت کا ضیاع سمجھتے ہیں اور جو طلبہ محنتی اور ذہن ہوتے ہیں۔ وہ خوب دل جمعی سے پڑھتے لکھتے اور امتحان میں صرف کام کی باتیں تحریر کرتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ طلباء جنہیں پرچہ یاد کرنے کی توفیق نہیں ہوتی وہ ٹوٹل پورا کرنے اور وقت گزارنے کے لیے ادھر ادھر کی باتیں لکھتے جاتے ہیں۔ جن میں کام کی باتیں نہ ہونے کے مساوی ہوتی ہیں۔ ایک شعر کی شرح ایک طالب علم کے پرچہ میں اس طرح دیکھی وہ لکھتے ہیں۔

ترے فراق کی راتیں کبھی نہ بھولیں گے
مزے ملے انھی راتوں میں عمر بھر کے لیے

مذکورہ بالا شعر امتحان میں شرح کے لیے پیش کیا گیا تھا جس کی شرح ایک طالب علم نے ان الفاظ میں کی

وہ راتیں تم بھول سکتے ہو میں نہیں۔ تم کہا کرتے تھے کہ چاندنی راتیں اکیلے میں کس سے دیکھی جاتی ہیں؟

کیوں کر دیکھی جاتی ہیں؟ میں کہتی تھی ہاں لیکن اب۔۔۔۔۔ میری تہنائی کو چاندی راتوں کے سوا کون دیکھتا ہے۔ تمہاری ساری باتیں غلط تھیں۔ تم کہا کرتے تھے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ اگر یہ بات ہے تو تمہاری طبیعت اپنے آپ کو کیوں نہیں دُہراتی۔

منور عثمانی کا شمار اکیسویں صدی عیسوی میں انشائیہ کو فروغ دینے والوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے انشائیہ نگاری کے نہ صرف عملی تخلیقی نمونے پیش کیے بلکہ انشائی تنقید میں بھی بھرپور کردار ادا کیا۔ ان کے انشائیہ اسلوب اور فکر یالحاظ سے قابل تحسین و تسکین ہیں۔

انجم نیازی:۔

انجم نیازی کے تخلیقی سفر میں دو باتیں متاثر کرتی ہیں۔ اول یہ کہ انہوں نے پہلے غزل کے شاعر کی حیثیت میں زندگی کے منفرد تجربے سمیٹے اور انہیں کفایت لفظی سے خوبصور تیسے کامیابی حاصل کی اور یہ کہ انہوں نے

انشائیہ لکھنا اس وقت شروع کیا جب ان کے تجربات حیات پکے ہوئے پھل کی طرح شاخ حیات سے ٹپکنے کے لیے تیار تھے اور انشائیہ کے خول میں پوری طرح سمیٹ گئے۔

انجم نیازی انشائیہ کی طرف پکی عمر میں راغب ہوئے لہذا ان کے ہاں تجربات کا وسیع ذخیرہ موجود ہے۔ انجم نیازی کے انشائیوں کا پہلے مجموعہ "سورج اور سمندر" جنوری ۱۹۹۱ میں منظر عام پر آیا۔ اس میں انیس انشائیے شامل تھے۔ انشائیوں کے موضوعات ان کی شخصیت اور انداز نظر کی عکاسی کرتے ہیں۔ "پہلی بات" شیخ چلی""شناخت" ،"زکام، بدتمیز"،" چار آنکھیں"، سوچنا، بڑکا درخت، ذمہ داری کا احساس، سفر، گلیشیئر، "ناک"، "سمندر"، "ٹائم آؤٹ"، "احتجاج"، "پیشنگوئی"، "سفر کرنا"، "دیانت داری"، اور "فل سٹاپ" کے عنوانات سے یہ تحریریں ایک ساتھ موجود ہیں۔

چونکہ انجم نیازی بنیادی طور پر شاعر ہیں اس لیے ان کے انشائیوں جن میں غزلیہ عنصر پایا جاتا ہے۔ ان کی غزل اور انشائیوں میں بہت مماثلت ہے۔ غزل میں انہیں سادہ اور رواں انداز بیان پسند ہے اس لیے انشائیہ میں بھی کوئی مشکل پسندی پیش نہیں آتی۔ انشائیہ مختصر جملوں میں سادگی کے باوصنف فکر و سوچ کی گہرائی سے تہی دامن نہیں ہوتا۔ غزل داخل اور خارج کے میل جول سے لکھی جاتی ہے۔ انشائیہ بھی انجم نیازی کے ہاں انکشاف ذات کے ساتھ ساتھ کائنات کے مناظر میں گم دکھائی دیتا ہے۔ انداز شگفتہ اور ملاحت آمیز ہونے کی وجہ سے طنز و مزاح ایک جیسے گھلتے ملتے محسوس ہوتے ہیں۔ ان کی تخیلاتی قوت بہت زبردست ہے۔

انور سدید ان کے انشائیے میں شاعرانہ برتاؤ کا تجزیہ کرتے ہوئے اسے اپنے لفظوں میں یوں بیان کرتے ہیں۔

> "غزل اور انشائیہ کی تخلیق کاری کو باہم ضم کرنا ممکن نہیں لیکن اکثر جب یہ دلچسپ صورت ہو جائے کہ غزل کا شاعر ہی ہمارے سامنے انشائیہ نگار کی صورت میں بھی آجائے تو کیا وہ ان مختلف النوع اصناف کی تخلیق کی حدود میں خاصہ امتیاز رکھا جاتا ہے میرا خیال ہے یقیناً رکھ سکتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ غزل شاعری کی صنف ہے اور انشائیہ نثر کی اور دونوں کی

حدود اظہار بھی مختلف ہیں۔ تاہم اگر ایک ہی شخص ان دونوں اصناف میں اظہار کی قدرت رکھتا ہو تو اس کی یکساں مشاہدے کی انکشاف کا سراغ دونوں اصناف میں لگایا جا سکتا ہے۔ انجم نیازی کے ہاں یہ بات مجھے بالخصوص نظر آتی ہے چنانچہ وہ کسی ایک نکتہ پر ارتکاز و فکر کرنے کے بجائے موضوع کے متعدد لفظوں کو روشن کرتے ہیں۔ ہر لفظ غزل کے شعر کی طرح اپنی انفرادی حیثیت بھی برقرار رکھتا ہے اور انشائیے کی مجموعی تاثر کو ابھارنے میں بھی اا ایک مکمل غزل کے اشعار ہی کے انداز میں وضاحت کرتا ہے۔"(۴)

شاعری اور انشائیے کی سرحدیں انجم نیازی کے بعض ہم عصروں کے ہاں بھی ملتی ہیں۔ ان کا اسلوب شگفتگی سے طنز و مزاح کی طرف آتا ہے۔ اکثر ان کا لب و لہجہ طنز و مزاح لیے ہوئے ہوتا ہے۔ طنز میں زیادہ رکاوٹ نہیں ہو گی اور مزاح بھی بڑا معقول اور مناسب ہوتا ہے جس طرح کا مزاح لکھتے ہیں وہ قاری کو بے اختیار مسکرانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس کے تقریباً تمام انشائیوں میں مزاح موجود ہے۔ کتنی ہی سنجیدہ بات کر رہے ہوں اس میں مزاح کا پہلو نکل آتا ہے۔

انجم نیازی کے انشائیوں میں اگر طنز و مزاح کی خصوصیات کے حامل انشائیوں کے نمونے تلاش کیے جائیں تو جابجا ایسے پیرگراف ملتے ہیں۔ ان کے انشائیے "بد تمیز" کا یہ پہلا پیرگراف ہی قارتین کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے:۔

"بد تمیز بہر حال ایک لفظ ہے اور لفظ خواہ سنسکرت کو ہو خواہ انگریزی کا اس کے اندر مفہوم کی روشنی ضرور موجود ہوتی ہے۔ مفہوم کسی کے لیے قابل قبول ہو یا نہ ہو لفظ کو اس سے کوئی غرض نہیں۔ مثال کے طور پر اگر میں آپ کو از راہ محبت بد تمیز کہہ دوں تو لفظ بد تمیز کو میری اس فراخ دلانہ عطایہ کوئی عتراض نہ ہو سکا اور اگر آپ اس کے جواب میں رسید کے طور پر مجھے اس سے کہیں بھاری بھرکم لفظ لوٹا دیں تو بد تمیز کا لفظ اس کو بھی میرے اور آپ کے ذاتی معاملات سمجھ کر مداخلت نہیں کرنے دے گا۔"(۵)

انجم نیازی کے ہاں خود کی شناخت کا رویہ بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ انشائیہ نگاری میں انکشاف ذات ایک اہم حیثیت رکھتی ہے۔ انشائیہ شے کے اندر داخل ہو کر اس کے معنی مفہوم تک پہنچنے کا عمل ہے۔

انجم نیازی کے ہاں انکشافِ ذات کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے ذات اور کائنات سے انجم نیازی جس طرح کھیلتا ہے۔ وہ انشائیہ نگاری کے منصب پر عہدہ برآ ہو جانے کے لیے کافی ہے۔

انشائیہ لکھتے ہوتے انجم نیازی موضوع سے اس طرح کھیلتے ہیں جیسے موسیقار اپنے سازوں سے نکلنے والے سروں کو اپنے جذبات کے زیر و بم کی حدود سے نئے نئے پیٹرن میں جوڑ کر تخلیقیت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ بالکل اس طرح انجم نیازی نے معنی آفرینی کے عمل میں اپنی ذات کی بیکرانی کو شامل کر کے اسے انوکھا اور منفرد بنا دیا ہے۔ غور کریں تو کائنات کے ایک کتاب کی طرح ہے جسے معاشرہ نہ صرف ہمیں پڑھ کر سناتا ہے بلکہ اس کے خاص معانی بھی فراہم کرتا ہے اور اس بات پر زور دیتا ہے کہ کائنات اس کے مقرر کردہ معانی غافل نہ ہو جائیں ۔ اس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ انشائیہ نگاری کی انفرادیت اس بات میں ہے کہ وہ کائنات کی لوح محفوظ کو معاشرے کے ہاتھوں سے چھین کر خود پڑھنے کی کوشش کرتا ہے لہذا معاشرے کی معانی کے علی الرغم معانی کا ایک نیا جہاں لا کھڑا کرتا ہے۔

انجم نیازی کی باتوں پر اگر غور کیا جاتے تو حیرت کا سامنا ہوتا ہے اس کے اندر کے صوفی کو ڈھونڈنے کے لیے "اگر" "سمندر میں غوطہ لگائیں تو "بڑ کے درخت" کے کنارے آدمی جا نکلتا ہے۔ اور بڑ کا درخت میوں کی طرح کا مزاج لے کر دنیا میں آیا ہے وہ ہمہ وقت رکوع کی حالت میں مصروف عبادت رہتا ہے اور اس کی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی اس کی اس حالت میں رخنہ اندازی کی کوشش نہ کرے۔ جب تیز ہوا اس کی تنہائی اور خاموشی میں بلا جواز مداخلت کرنے کی کوشش کرتی ہے تو اس کے اپنے صدائے احتجاج بلند کرنے کے لیے زور زور سے آپس میں ٹکرا کر بجنے لگتے ہیں جس کا مطلب ہوتا ہے۔ درویشوں کو تنگ ذکر دبا کر اپنا کام کرو ہمارے کام سے تمہیں کیا کام۔ ہم سادھو تم دنیادار۔ ہماری عبادت جس میں مخل ہو کر تمہیں کیا ملے گا۔

انجم نیازی آسمان کی بجائے زمین کی طرف رخ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ فطرتی مناظر کے ساتھ لگاؤ کا اظہار ہوتا ہے۔ قدرت کے ساتھ وابستگی لگاؤ ایک صاف و شفاف سوچ کا ہی نتیجہ ہے۔ سمندروں، درختوں، گلیشرز کی طرح انھیں فطرتی خوبصورتی بھاتی ہے۔ جب انسان بولنا شروع کرتا ہے۔ "پہلی بات" اس کے لیے بہت بڑی بات ہوتی ہے۔ اس پہلی بات جو انتہائی سادہ اور انتہائی پاکیزہ ہوتی ہے۔ اس انسان کی ساری سوچوں کا دیباچہ ہوتی ہے۔ حیرت ان کے ہاں جب گہری سوچ اور فلسفیانہ روپ اختیار کرتی ہے تو ان کے ہاں ایک مدلل انداز پیدا ہوتا ہے۔ اس سے انشائیہ بوجھل ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ ایسی حالت جن میں سوچ اور احساس کا عنصر نمایاں ہے یہ حالت ان کے انشائیوں میں نمایاں نظر آتا ہے۔ مثلاً "سوچنا" میں ان کا فلسفیانہ انداز بیان واضح نظر آتا ہے۔

> "دماغ کا رول دوسرے انسانی اعضاء سے ذرا مختلف مثلاً دونوں ٹانگیں ایک سا کام کرتی ہیں۔ اسی طرح دونوں کا ایک ہی کام ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کو سہارا دیتی ہیں۔ ایک کان بند ہو جائے تو دوسرا ڈبل شفٹ کے طور پر ہمہ وقتی ذمہ داری سنبھال لیتا ہے۔ اسی طرح آنکھیں اور ٹانگیں اپنی اپنی ذمہ داری سنبھالتی ہیں مگر دو ٹانگوں میں سے کوئی ایک معطل ہو جائے تو سارا نظام کا درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے۔" (۲)

انجم نیازی رجائیت پسند انداز شگفتہ مزاج قلم کار ہیں۔ وہ غایوں میں بھی امید کی کرن اور خوشی کی مہک تلاش کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس موضوع پہ بھی قلم اٹھاتا ہے خواہ کتنا ہی غیر ادبی ہوا اسے دلچسپ اور readable بنا دیتا ہے۔ انجم نیازی تنوع پسند ہے۔ اس کی نظر ایسے ایسے موضوعات تلاش کرتی ہے جن پر قلم اٹھانا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ اکثر ادیب گھسی پٹی باتوں کو دہرا کر Stageout ہو جاتے ہیں۔ مگر انجم نیازی کے قلم سے ان کی باتیں نموع پذیر ہوتی ہیں۔ گویا وہ نہ کسی سے فکر مانگتا ہے نہ الفاظ وہ اپنے خیالات اور اپنی لفظیات پر ہی بھروسہ کرتا ہے۔ اسی سے اس کو اسلوب اور اس سے اس کی انشائیہ نگاری صبح طلوع ہوتی ہے۔

ناصر عباس نیّر:۔

''چراغ آفریدم'' بیسویں صدی کے انشائی ادب کا آخری ذریعہ ہے۔ یہ کتاب ناصر عباس نیئر کے انشائیوں کا مجموعہ ہے جو اپریل ۲۰۰۰ء میں کاغذی پیرہن''لاہور کے زیر اہتمام طبع سے آراستہ ہوئی۔ اس میں کل چوبیس انشائیہ ہیں اور انشائیہ نگار بھی ہیں اورانشائیہ کے نقاد بھی۔ ان کے انشائیوں کا پیش لفظ سجاد نقوی جبکہ فلیپ ڈاکٹر وزیر آغااور ڈاکٹر بشیر سیفی کے مرقومہ ہیں۔

چراغ آفریدم میں شامل انشائیوں کے عنوانات ''کمرہ''،''معنی''،''بیماری''،شام''ناتجربہ کاری، ''تنہائی''، ''آخری آدمی''،''نئے موسموں کی ہوا''، دائرہ''،'' بے کاری اور بے روزگاری ''،''بوریت'' ،''فاصلے''،''شہرت کی مخالفت''،''میرا ننھا استاد'' ،''خواہش،''موت''،''کتنا قریب کتنادور'' ، '' تانگہ '' ، ''خاموشی'' ، ''پڑھنااور مطالعہ کرنا''،''سرما کی دھوپ''،''میں سوچتاہوں''اور قلم ہیں۔

ناصر عباس کے انشائیوں کا قدرے نمایاں وصف موضوعات کا تنوع ہے۔انہوں نے متنوع موضوعات پر انشائیے تحریر کیے ہیں۔ تاہم خصوصیت سے ابھرنے والا موضوع فطرت یا وہ موضوعات جو یہ براہ راست راہ معکوس فطرت سے متعلق ہی ہیں۔ کائنات کے رنگ و بو ایسا صحیفہ ہے گو ہمہ وقت انسان کے نظارے کا منظر ہے اور ہر انسان اسے اپنے فہم وادراک کے مطابق استفادہ کرتے ہوئے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ ناصر عباس نیر بھی فطرت کے مخفی پہلوؤں کو منظر عام پر لانے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ 'شام'' ''نئے ''نئے موسموں کی اور سرما کی دھوپ اس نوعیت کے انشائیے ہیں۔ان کے انشائیے''شام'' کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

> "شام اس قدرے ہولے سے افق پر قدم رکھتی ہے جیسے دلہن سسرال کی دہلیز پر قدم رنجہ فرماتی اور لجاتی ہے۔ مگر جس طرح دلہن کی موجودگی سے ایک دم سارا گھر بار اپنی جملہ مصروفیات ملتوی کر کے دلہن کا خیر مقدم کرنے اور اسے ایک نظر دیکھ لینے کو امڈ پڑتا ہے مگر دلہن سب سے بے نیاز اور شانت ہوتی ہے کچھ ایسا حال شام کا بھی ہے۔"(۷)

غور کریں تو ناصر عباس نیر نے شام کو دلہن سے تشبیہ دے کر اس کی خامشی اجنبیت کے پہلو کو اجاگر کیا ہے۔ ایک اور انشائیہ سرما کی دھوپ میں دسمبر اور مئی جون کے دنوں کا موازنہ کرتے ہیں۔ اس موسم میں ہوا گرم ہوتی ہے۔ جس سے بدن جلنے لگتا ہے۔ اور ہر ذی روح سائے کی تلاش میں ہوتا ہے۔ ایسے عالم میں فقط درخت میں جو دھرتی سے وفاداری مظاہرہ کرتے ہیں۔ سورج کے سامنے ایک ڈھال کی مانند قائم رہتے ہیں۔ اور اگر زمین درختوں کے وجود سے خالی ہو جائے تو سورج اور دیگر سماوی قوتیں زمین کو بنجر اور انسانی جسد کو راکھ کر ڈالیں لیکن سرما میں یہی صورت غنیمت سے کم نہیں ہوتی اور انسان اپنا بیش تر وقت سورج کی دھوپ میں گزارنے میں عافیت محسوس کرتا ہے۔

"سرما کی انہی مہربان دنوں میں ناشتہ کر کے چھت پر دھوپ میں آبیٹھتا ہوں دھوپ ہے کہ جو یقین نہیں آتا کہ وہی دھوپ ہے کہ جو مجھے گہنگار قرار دے کر سزا دیتی تھی۔۔۔ سرما کی دھوپ میں اپنے دوستوں سے گپ شپ کرنا مجھے بہت عزیز ہے کہ یہ گپ شپ طویل اور اکثر بے مقصد ہوتی ہے اس لیے میں کشادگی اور روح کو سبک سار کرنے والا لطف ہوتا ہے۔ کمروں کی گفتگو بالعموم مختصر جہت کے شعور سے آراستہ اور منصوبہ بندی کے تابع ہوتی ہے۔ جب کہ سرما کی دھوپ میں اندر کے سہارے منصوبے ڈھل جاتے ہیں۔"(۸)

انشائیہ نئے موسموں کی ہوا" میں وہ موسم کو ہوا کا رہن احسان قرار دیتے ہیں یعنی ہوا اور آب کی آمیزش کا نام مراسم ہے۔ اور اسی آب وہوا کی آمیزش کے تناسب ہی سے موسموں میں فرق واضح ہوا ہے۔ اور اسی موسم کی تبدیلی ہی سے تو درخت و فصلیں نیا روپ دھار لیتی ہیں۔ جس سے رنگ و بو کی دنیا یعنی جہاں آب گل میں حسن پیدا ہوتا ہے۔ ناصر عباس نیر کے انشائیوں کے بارے میں اردو انشائیہ کے بنیاد گزار ڈاکٹر وزیر آغا یوں رائے دیتے ہیں:

"آپ ناصر عباس نیر کے انشائیے پڑھیں تو آپ کو معمولی چیزوں اور افعال میں ایک جہان معنی نظر آئے گا۔ صنف انشائیہ کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ وہ ان گری پڑی چیزوں کو فرش خاک سے اٹھا لیتی ہے۔ جنہیں ہماری ادبی اشرافیہ سے ناکارہ سمجھ کر پھینک دیا تھا اور

پھر اسے جھاڑ پونچھ کر کیا سے کیا بنا دیا۔ انشائیہ نگاری کا یہی عمل نقاد کو بھی اس بات پر قائل کرتا ہے کہ وہ ان نام نہاد لکھاریوں سے متاثر ہوں جو میک اپ کے رسیا اور نمائش کے دل دادہ ہیں بلکہ ان تخلیق کاروں پر توجہ مبذول کی جن کی گڈریوں میں لعل چھپے ہیں۔ اس حوالے سے دیکھیں تو ناصر عباس نیئر نے نہ صرف زندہ رہنے والے انشائیے تخلیق کیے ہیں بلکہ صنفِ ادب کے طریقہ کار کو برت کر اپنی تنقید کو بھی تخلیق سطح تفویض کر دی ہے۔"(۹)

ان کے انشائیوں میں اپنے باطن میں عوامل کا عمل بھی واضح نظر آتا ہے مثلاً وہ انشائیہ ''بیماری'' میں بیماری کو ناگہانی آفت کے بجائے ایک نعمت قرار دیتے ہیں۔ جس سے انسان اپنے داخل کی طرف ملتفت ہوتا ہے کیوں کہ یہ بستر علالت ہی ہے جو انسان کو دوسروں کی ہم دردی امداد اور انسے رواداری کا درس دیتا ہے۔ اور انسان دولت کو ناپائے دار حقیر سمجھ کر زندگی کے حاشیے پر دھکیلے گئے بھکاریوں اور مفلسوں کے سپرد کرنے کو تیار ہو جاتا ہے ورنہ اس سے قبل تو وہ دولت پر سانپ کی طرح کنڈلی مار کر بیٹھ جاتا ہے کسی کو وہ کچھ دنیا تو الگ دوسرں کا دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔

انسان کا خارج داخل سفر تنہائی کا مرہون منت ہوتا ہے کیوں کہ تنہائی ہی انسان کو سوچنے پہ مجبور کرتی ہے۔ ناصر عباس نیئر کے انشائیوں کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ وہ انشائیہ کا آغاز ایسے سادہ اور دل موہ لینے والے جملوں سے کرتے ہیں کہ قاری انشائیہ کے سحر میں گرفتار ہو کر ایک ایسی کیفیت میں چلا جاتا ہے کہ وہ انشائیہ کو ختم کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اصل میں انشائیہ نام ہی ایسی تحریر کا ہے۔ جس میں انشائیہ نگاری قاری کو نئے معانی سے آشنا کرنے کے لیے ایسی زبان کا سہارا لیتا ہے۔ جو دلچسپ نرم، اور کومل الفاظ کا مجموعہ ہوتی ہے۔ ناصر نیئر کے ایک انشائیہ ''کمر'' کے اولین جملے ملاحظہ فرمائیں۔

اس طرح انشائیہ '' آخری آدمی'' کا آغاز یوں کرتے ہیں۔ پیچھے رہ جانے والے ہی زندگی کے اصل لطف سے آشنا ہوتے ہیں۔ مجھے یہ عرفان سائیکل ریس میں پیچھے رہ جانے والے نوجوان سے ملا۔

ناصر عباس نیر کے انشائیوں کا ایک اور صنف تشبیہات وستعارات کا استعمال ہے وہ اپنی بات کے بہتر ابلاغ قاری کی دلچسپی اور حظ اندوزی کا سامان کرنے کے لیے انشائیوں میں تشبیہات واستعارات کا بر محل استعمال کرتے ہیں۔ جس سے نہ صرف بات جلدی سمجھ میں آجاتی۔ بلکہ قاری عبارت سے لطف بھی لیتا ہے۔

عبدالقیوم:۔

عبدالقیوم کے انشائیوں کا مجموعہ ہے جو نقوش پریس لاہور کے زیر اہتمام فروری ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا، اس کا دیباچہ "عرض خدمت یہ کہ" کے نام سے عبدالقیوم نے خود لکھا ہے۔ اس کتاب میں چوبیس(۲۴) انشائیے ہیں اور اس کا انتساب اُردو انشائیہ کے بنیاد گزار ڈاکٹر وزیر آغا کے نام ہے۔ اس کتاب سے متعلق نمرہ فاطمہ یوں لکھتی ہیں:

> "اس کتاب میں کل چوبیس انشائیے ہیں جن میں کرسی، لمبی، چھلانگ، چھتری، خیالی پلاؤ، زندگی اور موت، وصیت نامہ اور جیب تراشی بے حد فن کارانہ طرز تحریر کے حامل ہیں، اور انشائیہ کی جو بنیادی تعریف کی جاتی ہے اس پر پورے اُترتے ہیں۔"(۱۰)

تاہم مناسب ہوگا کہ "خیالی پلاؤ" کا مجموعی جائزہ لیا جائے اس مجموعے کا پہلا انشائیہ "آئینہ" ہے جو حقیقت پسندی کی علامت ہے اور کبھی جھوٹ نہیں بولتا اور شے کو اس کی حقیقی صورت میں پیش کرتا ہے، آئینہ صرف شے کی خوبیوں ہی کو سامنے نہیں لاتا ہے بلکہ اس کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ جملہ اسقام اور کمزوریوں کے نقاب کرتا ہے۔

> "ہر وقت آئینے سے وابستگی چہرے کی چھوٹی موٹی خامیوں سے پردہ اُٹھاتی ہے چہرہ جو سرسری نظر سے آئینے میں دیکھنے پر اچھا لگتا ہے جب گہری نظر سے بہ غور اس کا جایزہ لیا جاتا ہے تو ناک کی بناوٹ میں آنکھوں کی رنگت اور پھیلاؤ میں، منہ کے چھوٹا یا بڑا یا نہ ہونے کا یا پھر ٹھوڑی کانوں کی بناوٹ میں کچھ نہ کچھ کمی اور خامی ضرور نظر آتی ہے اور دل کے کونے کھانچے میں یہ خواہش انگڑائی لے کر جاگ اُٹھتی ہے کہ کاش میری آنکھیں بڑی بڑی

ہلکی نیلی ہوتیں، ناک ہلکے سے خم کے ساتھ متناسب ہوتی، منہ کا سائز درمیانہ۔۔۔۔ اور یہ سب آئینے کا کرشمہ ہے۔"(۱۱)

انشائیہ نگار آئینے کی اہمیت یوں جتلاتے ہیں کہ اگر آئینہ نہ ہوتا تو انسانی حیات میں صورت کے بہ جائے سیرت کو اہمیت دی جاتی تاہم موجودہ دور میں انسان کا سیرت کے بہ جائے صورت کو اہمیت دینا آئینہ کی کرشمہ سازی ہے اور حسن و عشق کے تمام مناظر و تماشے بھی آئینے کے مرہونِ احسان ہیں۔ انسانی چہرے کو بھی آئینے کے مماثل قرار دیا جاتا ہے کیوں کہ چہرے سے باطن کی کیفیات منعکس ہوتی ہیں۔ انسان کے دل میں خوشی اور غمی کے جذبات بھی چہرے کے ذریعے ہی سے اظہار پاتے ہیں۔

انشائیہ نگار نے صنف نازک اور آئینے کو ایک دوسرے کے لیے لازم اور ملزوم قرار دیا ہے کہ حسیناؤں کو خود بین و خود آراء بنانے والی چیز کا نام آئینہ ہے اور وہ آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر احساس برتری کا شکار ہوتی ہیں۔ یہ احساس نوجوانی میں ان کے پاؤں زمین پر نہیں لگنے دیتا لیکن جب جوانی کا سورج ڈھلتا ہے اور بڑھاپے کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں تو وہ اپنی صورت آئینے میں دیکھ کر مایوس ہو جاتی ہے لیکن آئینہ تو اس وقت بھی جھوٹ نہیں بولتا بلکہ جو حقیقت ہوتی ہے اس کو عیاں کرتا ہے۔ دوستوں، عزیزوں اور رشتہ داروں کو لکھے جانے والے خطوط بھی تو مکتوب نگار کے تصورات، خیالات اور جذبات کا آئینہ ہوتے ہیں لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے حقیقت سے کام لے اور فن مکتوب نگاری کا اولین تقاضا ہی صداقت ہے۔

"خط لکھنے والا اگر آورد سے زیادہ کام آمد سے لے تو اس کے دلی جذبات کی بے لاگ صحیح ترجمانی ہوتی ہے اگر جملے بنا بنا کر ان میں کاٹ چھانٹ کر کے خط کی اشاعت کی خاطر ادبی تحریر کے زمرے میں لانے کی شعوری کوشش کرے تو پھر اکثر بہت کچھ چھپا رہتا ہے ایسے خطوط نظم و ضبط کے لحاظ سے تو قابل توجہ ٹھہرتے ہیں لیکن آئینہ دل پر نقش بن کر تادیر اپنا تاثر قائم نہیں رکھ سکتے۔"(۱۲)

انشائیہ ''چہرہ'' میں چہرے کو گزشتہ سات عجوبوں کے بعد آٹھواں عجوبہ قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ ایک تنگ حصے میں ڈھیر سارے اعضاء کا انبوہ ہے اور ہر انسان ناک، کان، زبان، ہونٹ، ٹھوڑی، دانت، گال، بھوئیں، ماتھے، نتھنے، ڈاڑھی اور مونچوں وغیرہ میں کوئی نہ کوئی تفریق ضرور ہوتی ہے۔ مزید بر آں چہرے کے خدوخال سے مختلف خصوصیات وابستہ ہوتی ہیں۔

"کشادہ ماتھا عموماً خوش بختی اور ذہنی کشادگی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ نیلی آنکھوں میں وفا ڈھونڈنی پڑتی ہے موٹے موٹے ہونٹ جنسی میلان کی غمازی کرتے ہیں اگر ہاتھ کی لکیروں میں قسمت کی شکل میں ماضی، حال اور مستقبل کی پرچھائیں دیکھی جاسکتی ہیں تو چہرے کے اعضاء کی بناوٹ اور رنگ ڈھنگ سے انسانی مزاج کی گرہ کشائی کوئی مشکل کام نہیں۔"(۱۳)

اور انسان کی پسند وناپسند کا تصور بھی چہرہ ہی سے ممکن ہے اگر کوئی چہرہ ایسا ہوتا ہے کہ جس کے اعضاء میں موزونیت کی کمی ہوتی ہے تو اکثر لبوں پر طنز کی لہریں اُبھرتی ہیں حالاں کہ کچھ چہرے باطن کے ہلکے پن کی وجہ سے قابلِ نفرت بن جاتے ہیں۔ چہرے کو کھلی کتاب بھی کہا جاتا ہے حالاں کہ اس کھلی کتاب میں معدودے چند ہی غوطہ زن ہو کر گوہرِ مقصود تک پہنچ پاتے ہیں ورنہ اکثر سطح پر ٹامک ٹوئیاں اور ہاتھ پیر مارتے رہ جاتے ہیں کسی کو ہونٹ کاٹنا یا دانتوں تلے دبانا، آنکھیں جھپکانا، گھورنا، بار بار بند کرنا اور کھولنا ماتھے پر تیوریوں کا باریک جا بننے اور غائب کرنے کا عمل۔۔۔۔ یہ اور اس طرح کی اَن گنت حرکات وسکنات اپنے اندر واضح اشارے کنائے اِس صورت میں رکھتی ہیں جب آپ ان کے ادراک کے لیے پس منظر سے وقفیت اور چہرہ شناسی کے تھوڑے بہت علم سے لیس ہوں ورنہ غلط نتیجہ اخذ کرنے کا اِمکان قوی تر ہوتا ہے۔

کسی کتاب کا سرورق بھی دراصل اس کا چہرہ ہی ہوتا ہے کیوں کہ قاری سرورق ہی سے س کتاب کے معیار کا تخمینہ کرتا ہے کہ کتاب کس نوعیت کی ہے۔ ہر چند کتاب کے راست مطالعہ کے بعد اِس بات کا علم ہوتا ہے کہ مصنف نے موضوع کو کس حد تک گرفت میں لیا ہے لیکن کتاب کا اِبتدائی تعارف اِس کا سرورق ہی ہوتا ہے۔ مزید

بر اں کتاب اور انسانوں کی طرح ممالک کے بھی چہرے ہوتے ہیں جن میں سے بعض ممالک میک اَپ کے ذریعے اپنے چہروں کو بدلنے کی مقدور بھر کوشش کرتے ہیں اور ذیلی ممالک کی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔

اس سے اگلے انشائیے کا عنوان ''خیالی پلاؤ'' ہے جس کا نام آتے ہی فوراً توجہ شیخ چلی کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے حالاں کہ اِس سے قبل بھی خیالی پلاؤ پکانے والے لوگ موجود تھے اور وہ عملی زندگی کے بہ جائے خیالی دنیا کو ہی اصل زندگی گردانتے تھے اب یہ رجحان قدرے زوال پذیر ہے۔ آج کل کے عملی دور میں خیالی پلاؤ پکانے والوں کی آؤ بھگت بھی کم ہو گئی ہے لوگ عملی زیادہ ہو گئے ہیں جس کے نتیجے میں شعوری طور پر نام دری کی دیوی کی نظرِ کرم کے لیے بے تحاشا تگ و دو کرنے والے اکثر خیالی پلاؤ سے لطف اندوز ہونے کی بہ جائے ذہنی دباؤ کا شکار ہو جاتے ہیں کیوں کہ وہ شیخ چلی کی طرح بے فکری کی دولت سے مالا مال نہیں ہوتے۔

ہر زمانے میں خیالی پلاؤ پکانے والوں کی کمی نہیں رہی لیکن اُن نتائج کے حامل لوگ، جن کا حصول ممکن نہیں ہمیشہ کے لیے ناکام رہے ہیں لیکن ایسا نہیں ہے کہ خیالی پلاؤ پکانا کوئی فضول بات ہے بل کہ عملی زندگی کی عمارت کی بنیاد ایک خیالی اور مفروضے پر رکھی جاتی ہے۔

اگر غور کیا جائے تو انسانی زندگی میں ہر عمل کا انحصار سوچ پر منحصر ہے پہلے سوچ بچار کے سمندر میں لہریں اُٹھتی ہیں اس کے بعد دل میں جذبات پیدا ہوتے ہیں اور انسان عمل کی وادی میں قدم رکھتا ہے یوں یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ہر عمل کی اساس سوچ ہے لیکن موجودہ زمانے میں اکثر افراد صرف خیالی پلاؤ پکاتے ہیں بل کہ اس کی باقاعدہ تشہیر بھی کرتے ہیں۔

> "شیخ چلی کی دانائی یہ تھی کہ وہ خوش آیند مستقبل کے لئے مستقبل کے لیے خیالی پلاؤ پکانے کو اپنے تک محدود رکھتا تھا اسی طرح خود ہی خوش ہو لیتا اور پھر ناکامی کی صورت میں مایوس ہو کر بھی کسی کو بھنک نہ پڑنے دیتا، یوں وہ اظہار سے اجتناب کی وجہ سے کسی کے لیے ذہنی کوفت کا باعث نہیں بنتا تھا جب کہ آج یہ حالت ہے کہ بڑے بڑے عہدوں پر فائز ذمہ دار لوگ خیالی پلاؤ پکانے کے عمل کو جزئیات سمیت مشتہر کر کے دوسروں کو بھی خیالی جنت میں لے جاتے ہیں۔"[۱۴]

اور پھر پہلی نظر کی محبت کی مثال بھی تو خیالی پلاؤ پکانے کے مترادف ہے کہ پہلی نظر ملتے ہی دونوں کے دلوں میں طرح طرح کے جذبات اُبھرتے ہیں اور نہ صرف خیالوں کی دُنیا میں محو ہو جاتے ہیں بل کہ تخیل کی کائنات میں بہت دُور نکل جاتے ہیں اور آخر کار ناکامی کی صورت میں ہوش آشنا ہوتے ہیں، تب ان پر حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔

"اسی طرح ہم شور کو عموماً نامانوس عنصر خیال کرتے ہیں کیوں کہ اس سے انسان کی طبیعت میں تناؤ اور ناگواری پیدا ہوتی ہے اور شور کرنے والے افراد ناپسند اور مکروہ خیال کیے جاتے ہیں لیکن بعض دیگر عوامل کی طرح شور بھی رائیگاں چیز نہیں بل کہ اس کی بھی اپنی جگہ اہمیت ہے۔"(۱۵)

صرف یہی نہیں بل کہ شور قدرت کو بھی ناپسند ہے کہ یہ بادل کا شور ہی ہے جو موسلا دھار بارش کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے اور انسان اس رحمتِ خدا کا تحفظ یوں کرتا ہے جیسے زحمت ہو اور اسوار پیایوں کو نظر انداز کرتے ہوئے منزل تک پہنچنے کے لیے سیماب صفتی کا مظاہرہ کرتے ہیں، انسان کے اندر بھی تو ایک مسلسل شور بپا ہے جو اِس کی بقا کا ضامن ہے۔

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق

نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

اور کہیں یہی شور احتجاج کی صورت بھی اختیار کر لیتا ہے۔

"بظاہر تو شور ایک ذاتی فعل ہے لیکن جب یہ بے ساختہ پوری قوت کے ساتھ سرزد ہوتا ہے تو دوسروں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور جب ذاتی فعل دوسروں کو متاثر کرنے لگے تو پھر اَن گنت افراد کی یکجوئی کا سبب بنتا ہے۔"(۱۶)

مزید بر آں آہ اور واہ بھی تو دونوں شور کی صورتیں ہیں شور کا بہترین انداز تو یہ ہے کہ چاک گریباں دُنیا کو متوجہ کیا جائے لیکن ایسی باتوں کا بڑے لوگ عموماً بُرا مناتے ہیں علاوہ ازیں کسی پر اعتراض کرنا اس کے کارناموں کو سراہنا، کسی کا انکار کرنا، کسی کو قایل کرنا یہ تمام صورتیں بھی تو شور سے متعلق ہیں اور بڑی بڑی کُرسیوں کے حصول کے لیے تگ و دو کرنا، چیخنا چلانا بھی تو شور ہی کا ایک طریقہ ہے وہ بھی تو شور کا اِستعارہ ہے۔ مصنف اِس بات کی تائیدِ اِن الفاظ میں کرتے ہیں اور وہی نوجوان جب کسی کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہو جاتا ہے تو اس پر بے خودی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ زلفوں کے بناؤ سنگھار اور اپنے آپ کو جاذبِ نظر بنانے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کرتا لیکن جب یہ چار روزہ بہار گزر جاتی ہے تو پھر سے اِس عمل کو ایک بار وبال سمجھنے لگتا ہے۔

سفر کے دوران جہاں کانٹوں سے واسطہ پڑتا ہے وہاں منزل پر پہنچ کر پھول بھی میسر آتے ہیں اور سفر اگرچہ اپنوں سے عارضی جدائی کی اذیت بھی دیتا ہے لیکن وطن واپسی پر ملاقات کے لطف کو دوچند بھی کر دیتا ہے۔ پرانے زمانے میں سفر کٹھنائیوں کے ایک طویل سلسلے کا اِستعارہ تھا گھاٹیوں، ریگستانوں اور پہاڑوں سے واسطہ پڑتا تھا لیکن سائنسی ترقی نے دیگر شعبۂ حیات کی طرح سفر میں بھی سہولیات میسر کی ہیں۔

میں جدید سفر کی سہولتوں سے مستفید ہو کر ہمیشہ سائنسی کرشموں کا احسان مند ہوتا ہوں کہ ریل گاڑی یا ہوائی جہاز مہینوں اور ہفتوں کے سفر کو دنوں اور گھنٹوں میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ پرانے زمانے میں لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی کے لیے پہلے رختِ سفر باندھتے تھے اور دورانِ سفر جہاں انھیں ضروریات زندگی میسر آتیں وہیں پر پڑاؤ ڈال لیتے اسی طرح دیکھتے ہی دیکھتے شہر کے شہر بس جاتے لیکن جب قحط کا عفریت انھیں قبضے میں لے لیتا تو ناچار نئے دیسوں کے راہی ہوتے۔ ابنِ بطوطہ، واسکوڈے گاما اور کولمبس نے سفر کے دوران و انکشافات کیے جو گھر بیٹھے ممکن نہیں تھے، ہر چند اِس زمانے میں سفر میں دُشواریاں تھیں لیکن فطرت کا اصول ہے کہ ہر دُشواری کے بعد آسانی ہے یقیناً وہ لوگ دُشواریوں سے گزر کر کامیابیوں سے ہم کنا ہوئے ہیں مثلاً کولمبس نے امریکہ دریافت کر کے تاریخِ عالم میں اپنا نام محفوظ کر لیا۔

دراصل سفر کا مزا تو پہیے کی ایجاد سے پہلے تھا کہ نہ پاسپورٹ کا چکر اور نہ دیگر خرچہ! بس جیب میں رقم ڈالی اور دو چار کپڑے رومال میں باندھے، ساگ روٹی، بھنے چنے وغیرہ پوٹلی میں رکھے اور جس طرح منہ ہوا چل پڑے، جوانی کی راتیں اور مرادوں کے دنوں کو سفر کی صعوبتوں کی نذر کر کے اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پی کر جب عرصہ بعد واپس لوٹے تو کالے بالوں کی جگہ روٹی کا ایک سفید گالا سر پر سجا ہوتا اور اکثر صورتوں میں پہنچاننے والے مر کھپ گئے ہوتے۔

نومولود کی آمد پر اس کے رونے کو زندگی کی علامت خیال کیا جاتا ہے لیکن وہ اپنی ماں کے نرم و گرم شکم سے دُوری اور زندگی کے سفر کی دُشواریوں کے باعث اشک بار ہو رہا ہو۔ ایک اور انشائیہ ''کرسی'' میں یوں گویا ہیں:

> "کرسی کی اداءِ بے نیازی مجھے بھلی لگتی ہے اِس لیے کہ وہ ہر ایرے غیرے کو بلا تفریق قبول کرلیتی ہے فراخ دل اتنی ہوتی ہے کہ جو بھی اس کی آغوش میں سماسکے اسے پناہ دیتی ہے۔"(۱۷)

مزید برآں کرسی جذبۂ خودی کی بھی حامل نظر آتی ہے کہ پلنگ اور چارپائی تو تو بہ یک وقت متعدد لوگ بیٹھ سکتے ہیں لیکن کرسی احساسِ یک تائی سے بہرہ ور ہے اور اپنی خودی کو کبھی داؤ پر نہیں لگاتی۔ ایک اور انشائیہ ''شام'' کی ابتداء ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

> "جب شام کا سورج مغرب کی گداز بانہوں میں دھیرے دھیرے قدموں سے اپنا چہرہ چھپانے کیلئے سجدہ ریز ہونے لگتا ہے تو اِس حوالے سے میرے کانوں میں میری مرحومہ ماں کی تشویش بھری آواز گونج اٹھتی ہے ''بیٹا شام سے پہلے گھر لوٹ آنا۔"(۱۸)

ماں کی بیٹے سے محبت فطری اَمر ہے اور اگر بیٹا شام کو لوٹ کر نہ آئے تو ہر ماں تشویش میں رہتی ہے اور اس وقت تک چین نہیں کرتی جب تک اپنے نورِ نظر پر نظر نہ پڑے لیکن نوجوانی کے دنوں میں شام کے دل فریب مناظر سے لطف اندوز ہونا بھی فطرتِ بشری ہے۔ ڈوبتے ہوئے سورج کے باعث اُفق پر نمودار ہونے والی شفق،

گھونسلوں کی سمت لوٹتے ہوئے پرندے اور مرغابیوں کا غول کی شکل میں واپس لوٹنا واقعی دل بر منظر ہوتا ہے اور ایسے میں کوئی نوجوان کاہے کو اپنے گھر کے اندھیرے میں گم ہو جائے؟

ہر چند شام کام کاج اور آرام کے مابین حدِ فاصل ہے اور جیسے ہی سورج شفق کی چادر اوڑھ لیتا ہے دیہاتی زندگی کی گاڑی کر بریک لگ جاتے ہیں اور ماحول پر سکوتِ پیہم کا ترنم چھا جاتا ہے اگرچہ اس یک سانیت کو سائنسی اور مادی ترقی نے بدلنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے لیکن دیہاتی زندگی آج بھی روایت کی پابند ہے۔

شب و روز کے اِس تضاد کے ساتھ ساتھ دن اور رات کی تقسیم ختم ہوتی جارہی ہے دن کو کام اور رات کو آرام والا فارمولا اب گھنا ہو چکا ہے، اب کئی لوگ دن کو کام کرتے ہیں اور رات کو آرام تو کئی رات کو کام کرتے ہیں اور دن کو آرام لیکن ان دونوں صورتوں کے برعکس ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو کام کرنے میں دن رات کی تقسیم سے ماوراہے اور جوں ہی چند لمحے فرصت کے میسر آتے ہیں سکون کر لیتا ہے۔

علاوہ ازیں شامِ غریباں جہاں خیامِ تشنہ لباں میں کہرام اور ہجوم ستم گراں میں جشن کا استعارہ ہے وہاں باطل قوتوں کے غروب ہونے ان کی شکستِ فاش اور حق کی فتح کا اعلامیہ ہے۔

عبدالقیوم انشائیے کا مستند نام اور ''خیالی پلاؤ'' انشائیہ نگاری کی روایت میں اہم اضافہ ہے۔ عبدالقیوم کا نام ان خوش نصیبوں میں سے ہے جنھوں نے اکیسویں صدی میں نہ صرف انشائیہ کی روایت کو برقرار رکھا بل کہ اس کی رگوں میں تازہ خون اُنڈیلنے کی بھی مقدور بھرپور کوشش کی۔

ب) ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کی انفرادیت:۔

اردو ادب میں صنف انشائیہ کے بانی اور کثیر تعداد میں انشائیہ لکھنے کے علاوہ اس پر تنقیدی پر مغز تحریری سپرد قلم کر کے دیگر اہل قلم کو اس کی طرف راغب اور اپنی زندگی میں اس صنف کو بام عروج پر پہنچانے والے ڈاکٹر وزیر آغا کے فرزند سلیم آغا قزلباش نے اردو اصناف میں جس صنف کو اولین توجہ کا مستحق سمجھا وہ انشائیہ ہی ہے۔ انشائیہ جیسی مشکل صنف سے ان کی والہانہ محبت ثبوت یہی ہے کہ جو بیس سال کی عمر میں بارہ انشائیوں کا پہلا مجموعہ

"سرگوشیاں" ۱۹۸۰ء میں پیش کر کے اس نئی صنف کی زرخیزی کے متعلق متذبذب اہل قلم میں براجمان رکاوٹ کو کافور کر دیا ہے۔

سلیم آغا نے افسانے بھی بڑے معرکے کے لکھے ہیں اور تنقید میں بھی ان کی گرفت زیر قلم موضوع پر اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ پڑھ کر قاری کا ذہن متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا۔ حاصل مطالعہ میں بھی وہ اپنے خیالات اور آراء کے جوڑ سے جوڑ ملاتے چلے جاتے ہیں۔

سلیم آغا قزلباش کے اب تک تین انشائی مجموعے بعنوان "سرگوشیاں"، "آمنا سامنا" اور "نام میں کیا رکھا ہے" منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ان مجموعوں میں شامل انشائیوں کی تعداد چالیس ہے اور یہ تعداد ان تخلیق کردہ معیاری انشائیوں کے حوالے سے حوصلہ افزائی کہی جا سکتی ہے۔ اس کا ایک اور انشائیوں کا مجموعہ "گرہ" زیر طبع ہے۔ اب اکیسویں صدی میں انشائیوں کے کتنے مجموعے قارئین کی نظر کریں گے اس کا انتظار رہے گا۔ پہلے مجموعے سرگوشیاں کے صرف اول میں مشتاق قمر نے انشائیوں کے بارے میں یوں اظہار خیال کیا ہے۔

> "سلیم آغا اپنی بات کا آغاز ایک معمولی غیر اہم نقطے سے کرتا ہے۔ لگتا ہے وہ لمحاتی طور پر کسی ایک واقعے سے متاثر ہو کر جذباتی انداز میں اپنے تاثرات کا اظہار کرنے چلا ہے، لیکن جوں جوں آگے بڑھتا جاتا ہے یہ معمولی غیر اہم نقطہ بے پناہ فکری وسعت اور گہرائی حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ سلیم آغا صرف سوال ہی نہیں اٹھاتا ان کے جوابات بھی مہیا کرتا ہے مگر انتہائی تخلیقی انداز میں۔"(۱۹)

ہر اچھے فنکار کی طرح ان کا رویہ توضیحی (Expalnatory) کم اور تشریحی Interpretative زیادہ ہے جس کے باعث وہ اپنے موضوع کو بے پناہ گہرائی اور وسعت عطا کرتے ہیں۔ اب برگد کے پیڑ کو دیکھ لیں اس کے نزدیک وقت کا کوئی لمحہ منجمد نہیں۔ ازل سے ابد تک چھپے ہوئے وقت کی ایک متحرک اور مضبوط کڑی ہے۔ انشائیہ میں سلیم آغا کی آمد سے انشائیہ وجودی طور پر بھی دوسری نسل کو منتقل ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیے کو منتقل صنف کے طور پر اختیار کیا اور ان کے زیر اثر انشائیہ نگاروں کا ایک خاص طرز کو آگے بڑھایا تھا۔ سلیم آغا

بھی اسی دبستان فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں شہری اور دیہاتی دونوں فضاؤں کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ لیکن ان کا رنگ خاص موضوع کی ندرت نہیں بلکہ اسلوب کی قدرت ہے۔ڈاکٹر وحید قریشی اس بات کے قائل ہیں کہ سلیم آغا قزلباش کے ہاں ہلکے پھلکے انداز میں گہری باتیں کہنے کا رجحان ملتا ہے۔ اس کا سبب وہ ان کی جزئیات نگاری کو دیتے ہیں۔ سرگوشیاں کے فلیپ پر درج ان کی رائے اس بات کی نشاندہی کرتی ہے۔

ان میں جزئیات کو پیش کرنے کی بے پناہ صلاحیت ہے۔ ہلکے پھلکے انداز میں گہری باتیں کہنے کا انہیں خاص ملکہ حاصل ہے۔ غیر اہم بات سے اہم بات کی طرف قاری کو آہستہ آہستہ کیے جانے کی بھرپور دسترس رکھتے ہیں۔

ان کی جزئیات نگاری کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کے انشائیے ''سرگوشیاں'' کا مطالعہ کیا جائے تو ان کی وسیع نظری واضح ہو جاتی ہے۔ ورنہ سرگوشیاں کرنے کا دائرہ صرف ''میں اور تو'' تک محدود ہوتا ہے۔ اس میں عموماً کوئی تیسرا شخص شامل ہو تو سرگوشی نہیں اور شے بن جاتی ہے۔

"آمنا سامنا" میں سلیم آغا نے ایک مشکل موضوع کو قلم کی زد میں لیا ہے۔ اکبر حمیدی نے آمنا سامنا کا تذکرہ کرتے ہوئے دیکھا ہے:

> "سلیم آغا نے یوں تو بہت سے موضوعات لکھے ہیں۔ مگر گزشتہ کچھ عرصے سے وہ مشکل علمی موضوعات پر انشائیے لکھ کر انشائیے کی نئی جہتوں میں بھی سفر کر رہے ہیں۔ یہاں خصوصیات سے ان کے انشائیہ ''آمنا سامنا'' کا حوالہ دوں گا۔"[۲۰]

انشائیہ ''آمنا سامنا'' میں مغربی مفکر ہربرٹ ریڈ کی اس بات سے سلیم آغا قزلباش نے روشنی حاصل کی ہے۔ کردار انسانی زندگی کا وہ واقع ہے جو اس شخصیت پر عمر بھر جاری رہتا ہے، سنجیدگی کا حامل اور فلسفیانہ لب ولہجے یہ انشائیہ سلیم آغا کی ذہنی بلوغت کی عمدہ مثال ہے۔ یہ توضیحی کم اور تشریحی زیادہ ہے کہ موضوع کسی زاویے دست گرفت میں آنا مشکل تھا۔

"نام میں کیا رکھا ہے" میں اپنے موضوع کے تمام ممکنہ دائروں اور زاویوں کو سامنے لانے کی کوشش سے عبارت ہیں۔ سلیم آغا موضوع کو عموماً اپنے انشائی مشائدے کے احاطے میں لا کر ایک نئی منطق کی آبیاری کرتے ہیں۔

سلیم آغا اپنے خیالات، تاثرات، احساس اور عرفان کے اظہار کے لیے بے حد سادہ لیکن نفیس اسلوب اختیار کرتے ہیں۔ کسی قسم کی ادبی آرائش لسانی اسلوبی کھیل تماشے عالمانہ رعب دعب اور صبر آزمانا مانوس لفظیات ان کی نثر میں کہیں نہیں۔ ان کے جملے حسب ضرورت مختصر بھی ہوتے ہیں اور طویل بھی لیکن ادھورے اکتا اور الجھا دینے والے اور بے جواز الفاظ سے تراشے ہوئے ہر گز نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی عبارت قاری کو فوراً اپنا ہمنوا بنا لیتی ہے۔

سلیم آغا قزلباش کے انشایئے میں سوچ اور فکر کے نئے افق طلوع ہوتے ہیں۔ اچھے انشائیہ نگار کے ہاں دو باتوں کا ہونا بہت ضروری ہے۔ ایک یہ کہ اس کی شخصیت میں وسعت اور گہرائی ہو۔ دوسرے اس کے انشایئے ایک بڑی تہذیبی اور ثقافتی منظر کو گرفت میں لیتے ہوں۔ یہ دونوں باتیں ان کے یہاں موجود ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی عطا یہ ہے کہ انھوں نے ادباء کے بطون میں جو انشایئے نگار موجود تھے انہیں تلاش کیا۔ دوسری اصناف ادب کے ہجوم میں گم ہو جانے کی بجائے انہیں مسلسل انشایئے لکھنے پر قائل کیا۔ ان میں سب میں سلیم آغا قزلباش کو یہ انفرادیت حاصل ہے کہ اسے انشایئے کا فن اکتساب کرنے کے لیے کسی استاد ادب کے سامنے زانوئے قلمبند کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ سلیم آغا کو انشائیہ کا شعور وراثت میں ملا ہے۔ انشائیہ ان کے خون میں شامل ہے۔ اس کے اظہار کے اولین جہت نے اپنا خمیر انشایئے سے اٹھایا ہے۔ چنانچہ اس کا معصوم جذبہ جب لفظوں میں ڈھلنے کے لیے بے قرار ہو گیا تو پہلی بار تحریر جو معرض وجود میں آئی وہ انشائیہ تھی۔ اس زاویے سے دیکھیں تو سلیم آغا نے انشائیہ کی گود میں آنکھ کھولی۔ انشائیہ کے گھوارے میں پرورش پائی اور اب انشائیہ ہی ان کی پہلی محبت نظر آتا ہے۔ دلچسپ بات کہ یہ اس محبت میں لہو کی وہ لاابالی پرواز موجود نہیں جو حدت جذبات کا نتیجہ ہوتی ہے بلکہ اس میں عقیدت اور سپردگی زیادہ نظر آتی ہے اور ان کا مادری مزاج ظاہر کرتا ہے کہ سلیم آغا نے اس صنف کو ام

لاضاف کے طور پر قبول کیا ہے۔ ان معاصرین میں سلیم آغا قزلباش کو یہ انفرادیت حاصل ہے کہ ان کو انشایئے کا فن سیکھنے کے لیے کسی استاد ادب کے سامنے زانوئے قلمبند ہونے کی ضرورت نہیں پڑی۔ سلیم آغا کو انشایئے کے شعور اور فن وراثت میں ملا۔ انشائیہ ان کے خون میں شامل ہے۔

بیسویں صدی کی چھٹی دہائی سے جدید انشائیہ کی نمو ہوئی۔ اسے خوب پنپنے کا موقعہ ملا۔ بہت سے اہل قلم نے اس صنف کی آبیاری کی۔ اب یہ پودا تن آور درخت کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اگر اس کی آبیاری اسی طرح ہوتی رہی تو یہ صنف ادب ایک چھتنار کا روپ دھار جائے گی۔ جدید اردو انشائیہ کی پاسداری کرنے والے مصنفین نے آنے والے لکھاریوں کے لیے راستے روشن کر دیئے ہیں۔ امکان ہے کہ انشائیہ ایک صنف کے طور پر اپنی مقبولیت میں اضافے کا باعث بنے گا۔

سلیم آغا کے ہاں عصری شعور ان کے انشائیوں کی ادبی تہہ میں نظر آتا ہے۔ ایک تخلیق کار تشبیہہ و استعارات، علامت و اساطیر کے پردے میں اگر اپنے عصری شعور کی صورت گری کے فرائض سرانجام نہیں دے سکتا اور اس کا فنی کمال ادھورا رہ جاتا ہے۔ انشائیہ بظاہر ایک پر مسرت اور برجستہ تحریر کا نام ہے مگر یہ فکرو تفکر اور عصری شعور سے خالی نہیں ہوتا۔ اردو ادب میں جو انشائیہ نگار اس کے ادبی تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس کی شعریات کے اندر اپنے زمانے کی ابھی اور بے ترتیب زندگی کا نقشہ کشی پر قادر ہیں تو ان میں سلیم آغا بھی نمایاں ہیں ۔ سلیم آغا کو انشائیہ کی روایت وارثت میں ملی ہے۔ اس کے باوصنف اس صنف میں ان کا اپنا الگ طرز تحریر اور منفرد اسلوب ہے۔ ان کے تین مجموعے "سرگوشاں"۔ "نام میں کیا رکھا ہے" اور " آمنا سامنا" ہیں۔ انشائیہ بظاہر ایک مسرت انگیز اور شگفتہ تحریر کا نام ہے لیکن اس سے فکرو فلسفہ اور عصری شعور کو کسی صورت الگ نہیں کیا جاسکتا۔ انکشاف ذات ان کے انشائیوں کی سب سے بری خوبی ہے۔ اور شاہد یہی وجہ ہے کہ وہ ہر انسانی رویے، ماحول اور چیزوں کے بارے میں بے لاگ تبصرہ کرتے ہیں اور رائے بھی دیتے ہیں۔ ان کا طنزو مزاح کا رنگ بھی واضح ہے۔ ان کے انشائیوں میں فلسفیانہ رجحان بھی ہے۔ ان کے فلسفے کو سمجھنے کے لیے مطالعہ کی وسعت اور ذہنی پختگی کی ضرورت ہے۔ وہ فلسفیانہ انداز اختیار کرتے ہیں مگر سادگی سے ایسا نقطہ نظر بیان کر دیتے ہیں۔ سلیم آغا کے

انشایئے اس بات کے آئینہ دار ہیں کہ ایک ایک انشائیہ نگار طنز و مزاحیہ اسلوب کو اختیار کرتے ہوئے بھی نکتہ آفرینی، انکشاف ذات، فطری مظاہر کے مخفی گوشوں کو بے نقاب کر سکتا ہے اور یہی بات ان کو دیگر معاصر انشائیہ نگاروں سے ممتاز کرتی ان کی انفرادیت کو سامنے لاتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ منور عثمانی، فرنٹ سیٹ، سانجھ پبلی کیشنز ۲۰۱۰، بیک فلیپ، ڈاکٹر وزیر آغا

۲۔ Amjad Pervaz, Dr. Rainbow of Reflection Jahangir Book, Lahore, 2010, Pg 339

۳۔ منور عثمانی، فرنٹ سیٹ، سانجھ پبلی کیشنز ۲۰۱۰

۴۔ انور سدید ڈاکٹر، انجم نیازی کی انشائیہ نگاری، مشمولہ، میں سورج اور سمندر مکتبہ فکر و خیال لاہور، ص ۱۱

۵۔ ایضاً، ص ۱۹

۶۔ ایضاً ص ۴۰

۷۔ ناصر عباس نیئر، ڈاکٹر آفریدم، کاغذی پیپر ہن لاہور، ص ۹

۸ ایضاً، ص ۹۶، ۹۷، ۹۸

۹۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر چراغ آفریدم، کاغذی پیر ہن، لاہور ۲۰۰۰

۱۰۔ نمرہ فاطمہ، ماہنامہ "ماہِ نو" لاہور، نومبر ۲۰۰۶ء

۱۱۔ عبد القیوم، خیالی پلاو، نقوش پریس لاہور، فروری ۲۰۰۶ء، ص ۱۲-۱۱

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۲

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۷

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۸

۱۵۔ ایضاً، ص ۲۲

۱۶۔ ایضاً، ص۲۳

۱۷۔ ایضاً، ص۲۴

۱۸۔ ایضاً، ص۱۳۴

۱۹۔ سلیم آغا قزلباش ''نام میں کیار کھاہے'' کاغذی پیر ہن، لاہوی، جنوری۲۰۰۵

۲۰۔ سلیم آغا قزلباش، نام میں رکھاہے، ''فلیپ از جمیل آزد

باب پنجم:

مجموعی جائزہ

انشائیہ اردو ادب کی کی اہم صنف ہے۔ تاہم جدید اردو انشایئے کا آغاز وارتقاباقی اصناف کی نسبت دیر سے ہوا۔ بیسویں صدی عیسوی میں مغربی تہذیب وادب کے مشرقی تہذیب وادب پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ اردو ادب میں جہاں تراجم سے کام لیا گیا وہاں مغربی اصناف ادب کو مشرقی اصناف ادب میں فراخ دلی سے رائج کرنے کی کوشش کی گئی جس طرح شاعری میں آزاد نظم اور نثر میں انشائیہ اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

مونتین نے انشائیہ کے لفظ اسائی (Essai) استعمال کیا ہے۔ اس کے برعکس انگریزی زبان میں Essai کا متبادل لفظ Essay تجویز کیا گیا جو بعد میں تمام غیر افسانوی نثری اصناف کے لیے استعمال ہونے لگا۔ جس کے باعث بیسویں صدی عیسوی کے انگریزی ادبا نے لفظ ایسے (Essay) کے ساتھ پرنسل (Personal) یا لائٹ (light) کا سابقہ لگا کر اسے عام مضمون نگاری سے الگ صنف ادب کی حیثیت ملی۔

اردو میں انشایئے کے تصور سے حقیقت بننے کا سفر ڈاکٹر وزیر آغا کا مرہون منت ہے۔ آج ہم اردو انشایئے کی حدود اور مزاج کو لائٹ یا پرسنل ایسے کے انگریزی نقادوں کے حوالے کے بغیر بڑے اعتماد کے ساتھ معرض بحث میں لاتے ہیں تو اس کے پیچھے ڈاکٹر وزیر آغا کی بصیرت انشائیہ کار فرما ہے۔

بیسویں صدی میں ایسے (Essay) کی پہچان ہونے لگی اور ہمیں متعدد ایسے مغربی انشائیہ نگاروں نے ایسے کے ساتھ Personal یا Light کا سابقہ لگا کر اسے ممیز کرنے کی سعی کی ہے۔ ان میں ورجینا وولف، چیٹرن، لیوکس، بیر بہوم اور رابرٹ لنڈ وغیرہ ایسے لوگوں میں شامل ہیں۔

انشائیہ (ایسے) کی صنف میں یہ اعزاز مونتین کو حاصل ہے کہ اس نے اس صنف کو باقاعدگی سے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ اس کو دوسری اصناف میں ضم نہیں ہونے دیا اور اسے مسلسل برت کر ایک علیحدہ صنف کی صورت دے دی۔

انشائیہ بیسویں صدی کے نصف آخر میں ایک ادبی صنف کی صورت اختیار کرتا نظر آتا ہے۔ انشائیہ کو تقویت دینے والوں میں سر فہرست ڈاکٹر وزیر آغا ان کے علاوہ جمیل آذر، مشتاق قمر، انور سدید، غلام جیلانی اصغر اور سلیم آغا قزلباش کا نام نمایاں ہے۔ انشائیہ نگاری میں ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ انھوں نے انشائیہ کو تازہ خون مہیا کرنے کے لیے مغرب کے انشائی ادب کا وسیع مطالعہ کیا۔ ''مغرب کے انشائیے'' کے عنوان سے چند منتخب انشائیوں کا ترجمہ بھی کیا۔ جس کی وجہ سے ان کو اس صنف ادب کو سمجھنے میں بڑی مدد ملی۔ تازگی ان کے انشائیوں کا وصف ہے۔ ایک ہی جملے میں بڑی بڑی باتیں کہہ جاتے ہیں اور قاری کو مسکراتا چھوڑ کر بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش انشائیہ نگاروں کے دوسرے دستے میں شامل ہیں اور انشائیہ نگاروں کی نئی نسل میں ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کے انشائیے فکری گہرائی اور سادگی و پرکاری کا دل آویز نمونہ ہیں۔ ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کے انشائیوں میں اشیا کو وسیع تناظر میں دیکھنے اور خیال کی مختلف پرتیں الٹنے کا عمل نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ ان کے انشائیوں میں سیاسی شعور، عصری آگہی، سماجی اور نفسیاتی پہلو اور فنی خصائل کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جو چیز ان کے انشائیوں میں قدر مشترک ہے اور ان کے موضوع کے ساتھ وابستگی ہے۔ جسے وہ تجزیاتی مشاہدے اور فنکارانہ غیر وابستگی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

کسی بھی تخلیقی سرمائے کی بنیادی شرط تازگی ہوتی ہے۔ اگر کسی فن پارے میں تازگی نہیں تو وہ فن پارہ چباتے ہوئے موضوعات والفاظ سے باہر نہیں نکل پاتا تو پھر اس کے ہونے کا جواز نہیں بنتا اور سلیم آغا کو شروع ہی سے یہ بات ابتدا ہی سے معلوم ہے کہ تازگی تخلیق کی روح ہے۔ انشائیہ جس کی بنیادی ضرورت یہی ہے کہ اسے مضمون، افسانے دیگر نثری تحریروں سے الگ کرنے کے لیے ندرت کا حامل ہونا چاہیے۔ اگر ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش

کے انشائیوں کا جائزہ لیا جائے تو تازگی اور مختلف اسلوب ان کی اولیں خصوصیت قرار پاتا ہے اور وہ انہی بنیادوں پر اپنے آپ کو ہم عصروں سے مہمیز و ممتاز بنانے میں کوشاں نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش نے اپنے انشائیوں میں ادبی اصطلاحات کا بھی خیال رکھا ہے۔ ان کے انشائیے موضوعاتی اور اسلوبیاتی لحاظ سے عصری شعور، فی زمانہ صورت حال کی واضح تصویر پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کی انشائیہ نگاری ہمیں قدرے نمایاں پہلو ہے۔ وہ موضوعات کا انتخاب ہے۔ موضوعات کے حوالے سے ان کے انشائیوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلی قسم غرمرئی موضوعات کی ہے۔ جس میں عادات اور خصائل برخامہ فرسائی کی ہے۔ دوسری قسم کے موضوعات معمولات کی زندگی سے متعلق ہیں۔ تیسری قسم داستانوی انداز کے حامل موضوعات کی ہے اور یہی وہ چیز ہے جو انشائیوں میں قدرے مشترک ہے۔ انشائیوں کے موضوعات سادہ اور عام فہم ہیں۔ ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کا قلم معمولی، حقیر اور کم تراشیااور موضوعات کو چھوتا ہے۔ جن کو اکثر ادباء نظر انداز کر دیتے ہیں۔ غیر ضروری سمجھ کر حاشیہ میں جگہ دینے کے روادار بھی نہیں ہوتے۔ موضوع کے انتخاب کے بعد ان کا اسلوب بھی نمایاں ہے۔ ان کے انشائیوں کی خوبی شگفتہ اور رواں اسلوب تحریر ہے بلکہ وہ سلیس اور آساں زبان کے ساتھ ساتھ سوچ و فکر کا پہلو بھی پس پشت ڈال دینے کے قائل نہیں۔ ان کے انشائیے جہاں اسلوب کے حوالے سے کامیاب ہیں وہاں نکتہ آفرینی کا بھی بہ طریق احسن خیال رکھتے ہیں۔

سلیم آغا قزلباش انشائیے کا اختیام ایک ایسے پیراگراف پر کرتے ہیں جو درج بالا بحث کے حامل کا درجہ رکھتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے اب تک کی جانے والی بحث کے بعد وہ آخری پیراگراف نتیجہ کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ وہ دیگر انشائیہ نگاروں کے برعکس اپنے انشائیہ میں اختصار سے کام نہیں لیتے بلکہ موضوع کے جملہ پہلوؤں کے انکشاف کی ممکنہ کوششیں کرتے ہیں اور مخفی نکات کو سامنے لاتے ہیں۔ جس سے ان کا انشائیہ طویل ہو جاتا ہے۔ یہی خوبی ڈاکٹر سلیم آغا کو دوسرے انشائیہ نگاروں سے الگ کرتی ہے۔

ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کے انشائیوں میں عصری شعور بہ درجہ اتم موجود ہے۔ سلیم آغا قزلباش طنز نگار یا مزاح نگار کی طرح تہذیب مشرق و مغرب کی خامیاں اور کمزوریاں ہی بیان نہیں کرتے بلکہ ان تہذیب کی خوبیوں

اور عالمی ادب کی مثالوں کو بھی پیش کرتے ہیں یعنی وہ ایک معتصب شخص کی طرح صرف تصویر کا معنی یا تاریک پہلو نہیں دیکھتے بلکہ روشن پہلو کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔ انشائیہ چونکہ بھاری بھر کم جملوں اور بوجھل تراکیب کا متحمل نہیں ہوتا اس لیے سلیس اور سادہ زبان کا استعمال ہی مناسب ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش بھی انشائیے کی زبان سادہ اور رواں استعمال کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے باقی ہم عصر انشائیہ نگاروں سے الگ مقام رکھتے ہیں۔

نتائج

- ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش اردو ادب میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے انشائیہ اعلیٰ پائے کے لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسری اصناف افسانہ، نثری نظمیں اور تنقید پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ آج کے دور میں ہر چیز کی ماہیت کا اندازہ اس کی عصری اہمیت وافادیت سے لگایا جاتا ہے۔

- عصری شعور کے مسائل کی مروجہ فہرست میں چونکہ سیاست، معاشی ناہمواری اور ظلم استبداد سرفہرست ہے لہٰذا ہم انہیں پہلوؤں کو عصری شعور کے مترادف سمجھنے لگتے ہیں جس کا نتیجہ ادب میں پراپوگینڈا کی صورت میں ہم سب کے سامنے ہے۔ چنانچہ ضرورت اس امر کی ہے کہ عصریت کو اس بڑی لہر کے طور پر لیا جائے جو عصری مسائل کے متلاطم سمندر کی بالائی سطح کے نیچے چل رہی ہوتی ہے۔ اسی طرح عصری مسائل کو اجتماعی مسائل کے کلی شعور کے بغیر سمجھ پانا مشکل ہے۔

- انشائیہ سطحی یا ہنگامی نوعیت کے مسائل پر سے پردہ نہیں اٹھاتا بلکہ وہ پوری نوع انسانی کو درپیش مسائل کو فن کی سطح پر لا کر طشت از بام کرتا ہے۔ اس سے قطع نظر فرد کے شخصی مسائل اور اس کے چاروں طرف پھیلے ہوئے مسائل کو الگ الگ خانوں میں بانٹ کر دیکھنا بھی مناسب نہیں کیونکہ ہر بات ناممکن ہے کہ کوئی شخص یا لکھاری عصری مسائل سے خود کو منقطع کر کے ادب تخلیق کر نہیں سکتے۔

- عصری مسائل کو محض باہر کی دنیا میں موجود سمجھنا بھی ٹھیک نہیں ہے کیونکہ فرد کی ذات میں تو عصری آگہی اپنے جملہ مسائل اور آلام کے ساتھ منسلک اشیا اور مسائل کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سلیم آغا قزلباش کے انشائیوں کے موضوعات سادہ ہیں۔ ان کے انشائیے مزاحیہ نہیں بلکہ مزاحیہ لب ولہجے کے حامل ہے۔ اس کے علاوہ ان کے انشائیوں میں عصری مسائل کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان کے باقی معاصرین میں یہ چیز نظر نہیں آتی۔

- ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش عصر حاضر کے اہم انشائیہ نگار ہیں۔ ان کے انشائیوں کا بہ غور مطالعہ کرنے کے بعد یہ پہلو اجاگر ہوتا ہے کہ یہ مغربی ادب کو شوق سے پڑھتے ہیں۔ زیر نظر مقالہ لکھنے کے بعد مجھے موضوع مقالہ کی شخصیت اور انشائیہ کے اسلوب کو جاننے اور سمجھنے کا موقع ملا۔

سفارشات

- ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کے انشائیوں میں موجود دیہاتی منظر نگاری پر کام کیا جا سکتا ہے۔
- اردو ادب کی دیگر اصناف کی نسبت انشائیہ مشکل ترین صنف ہے۔ جس کی وجہ سے جہاں اس صنف میں تخلیقی سطح پر کمی نظر آتی ہے۔ وہاں اس صنف پر تنقیدی اور تحقیقی سطح پر کام کرنے کی بہت ضرورت ہے۔
- بیسویں صدی کے انشائیہ نگاروں پر تو کام ہو چکا ہے لیکن اکیسویں صدی کے انشائیہ نگاروں پر کام کیا جا سکتا ہے۔

کتابیات

کتب استفادہ:۔

- سلیم آغا قزلباش،ڈاکٹر، آمناسامنا، مکتبہ فکر وخیال،لاہور،۱۸،۱۹۸۷ء
- سلیم آغا قزلباش،ڈاکٹر، سرگوشیاں، مکتبہ اردو، ریلوے روڈ سرگودھا،۱۹۸۰ء
- سلیم آغا قزلباش،ڈاکٹر، نام میں کیا رکھا ہے، کاغذی پیر ہن، ۲۷ بیڈن روڈ، لاہور، ۲۰۰۵ء

مجوزہ کتب:۔

- اکبر حمیدی، جدید اردو انشائیہ، اکادمی ادبیات، پاکستان، ۱۹۹۱ء
- انور سدید، ڈاکٹر، انشائیہ اردو ادب میں، مکتبہ فکر وخیال لاہور ۱۸، ۱۹۸۵ء
- بشیر سیفی، ڈاکٹر، اردو میں انشائیہ نگاری، نذیر سنز پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۲ء
- بشیر سیفی، ڈاکٹر، انشائیہ کی بنیاد، نذیر سنز پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۰ء
- جمیل آذر، پروفیسر، اردو کے بہترین انشائیے، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا
- جمیل آذر، پروفیسر، انشائیہ اور انفرادی سوچ، نقش گر پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۰۴ء
- رفیع الدین ہاشمی، اصناف ادب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
- سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو میں انشائیہ نگاری، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء
- سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، اشارے، نقش گر، راولپنڈی، ۲۰۱۱ء
- سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، منتخب انشائیے، مکتبہ اردو زبان، لاہور، ۱۹۸۴ء
- سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، نئے انشائیے، مکتبہ فکر وخیال، لاہور ۱۸، ۱۹۹۲ء
- شفیع ہمدم، معاصر ادب اور ادیب، مقبول اکیڈمی، لاہور

- غلام جیلانی، اصغر، انشائیہ کیا ہے، مشمولہ: اوراق، ۱۹۷۲ء
- محمد اسد اللہ، انشائیہ کی روایت مشرق و مغرب کے تناظر میں، ماڈرن پرنٹ، محمد علی روڈ، مومن پورہ، ناگپور ۱۸، انڈیا
- محمد اسد اللہ، یہ ہے انشائیہ، سلمان فائن آرٹس مومن پورہ ناگپور، ممبئی، ۲۰۱۷ء
- منور عثمانی، رشید احمد صدیقی کے انشائی تیور، اردو اکیڈمی بہاولپور، ۲۰۰۲ء
- ناصر عباس نیئر، ڈاکٹر، چراغ آفریدم، کاغذی پیرہن، لاہور، ۲۰۰۰ء
- وزیر آغا، ڈاکٹر، انشائیہ کے خدوخال، مکتبہ فکر و خیال لاہور ۱۸، ۱۹۹۰ء

انگریزی کتب:۔

Dictionary of Literary Terms and Literary Theory, London

رسائل:۔

- کاغذی پیرہن، لاہور
- الزبیر، بہاولپور، ۲۰۱۰ء
- ماہنامہ قومی زبان اردو، کراچی، نومبر ۲۰۱۳ء
- ماہنامہ تخلیق، لاہور

انٹرنیٹ، ویب سائٹس:

- www.rekhtaurdu.com
- www.bazmeurduliberary.com